
مابدولت
شوکت تھانوی

مابدولت

شوکت تھانوی

ادارہ فروغ اردو لاہور

بار چہارم

قیمت -/۶

پرنٹر و پبلشر
محمد طفیل مالک ادارہ فروغ اردو
لاہور

مطبوعہ
نقوش پریس - لاہور

خان بہادر سیّد عین الدّین صاحب او۔بی۔ای

دیوان ریاست دتیا

کی خدمت میں

جن کے ہاتھوں میری زندگی کا سنگ بنیاد

رکھا گیا

ترتیب

بہار الحسن

کچا چٹھا

نہ میں مہاتما گاندھی ہوں۔ اور نہ مجھے تلاشِ حق نے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رُخ کو اس قدر سچائی کے ساتھ پیش کر دوں کہ وہی سچ میری شامت بن کر میرے سامنے آجائے۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ میں نے سچ بولنے کی نہایت خطرناک کوشش کی ہے اور در اصل اپنے ان حالات کو پیش کرنا ہی ایک قسم کا اقدامِ خودکشی ہے۔ مہاتما گاندھی کا کیا ہے۔ وہ تو بچپن ہی سے مہاتما چلے آرہے ہیں۔ بڑے سے بڑا جرم انہوں نے یہ کیا ہے کہ گوشت کھا لیا یا کسی دوست کے بہکانے سے کسی بیسوا کے یہاں چلے گئے۔ اور وہاں سے صاف نکل آئے۔ لیکن یہ خاکسار نہ تو کبھی مہاتما تھا۔ نہ اب ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے مہاتما گاندھی کی طرح اپنے حالاتِ زندگی یہ مہاتما ہو جانے کے بعد بھی نہیں بلکہ اس اصول کی خلاف ورزی کی عین حالت میں لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں طرح طرح کے اندیشے سامنے ہیں۔ دوست خفا ہو جائیں گے، لوگ پست رائے قائم کر لیں گے بزرگ نالائق سمجھینگے

لگیں گے۔ اور سب سے بڑھ کر بیوی . . . ذرا ٹھہر جائیے مجھے اس تصوّر سے پھر اختلاج ہونے لگا۔ بات یہ ہے کہ بیوی لاکھ ہمدم و ہمراز سہی مگر عقلمند آدمی ہر بات تو بیوی سے کہا نہیں کرتے۔ اور نہ در اصل بیوی سے ہر بات کہنے کے بعد ایک شوہر کو وہ عافیت حاصل ہو سکتی ہے۔ جو اپنی تاریکیوں پہ روشنی نہ ڈالنے کی صورت میں حاصل رہتی ہے۔ بیوی کو ہماری جتنی خامیوں کا علم ہے وہی کیا کم ہیں ہماری موت کے لیے کہ اب ہم اس موت کو اور بھی قریب کرنے کے لیے مارے شیخی کے اپنے کو بالکل بے نقاب بنا کر ان کے سامنے پیش کر دیں۔ مگر جب کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ یہ بھی ایک قسم کا اقدام خودکشی ہے۔ میں پوری کوشش یہی کروں گا کہ جہاں تک ہو سکے صحیح بولوں البتہ شبہ اس سلسلہ میں یوں ہے کہ اگر مہاتما گاندھی کی طرح میری زندگی بھی معصوم ہوتی تو میں جھوٹ موٹ بھی جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرتا۔ مگر یہاں تو سوائے جرائم کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ طرح طرح کی بد اعمالیوں سے عنوانیوں اور اخلاق سوزیوں کے سوا اور اس ہیچمدان کی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے مگر جو چیز ہم سے یہ حالات لکھوا رہی ہے۔ اس کا نام ہے "خوفِ خدا" اپنی زندگی پر جب کبھی خود اپنی نظر پڑ جاتی ہے اور سنجیدگی سے غور کرنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو گھنٹوں غور کیا کرتے ہیں کہ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہم سے وہ سب کچھ کیوں کہہ دہرایا جائے گا جو ہم کر چکے ہیں۔ بہتر یہی ہے۔ کہ خود ہی اقبالی مجرم بن جائیں کیا عجب کہ یہی اعتراف رحمت کو جوش میں لے آئے وہاں تو خیر رحمت

پر بھروسہ ہے۔ مگر گھر میں کیا ہوگا۔ بیگم صاحبہ کے سلسلہ میں تو رحمت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ عفو کا کوئی امکان ہی نہیں۔ یوں ہی اپنے شوہر سے بہت زیادہ خوش عقیدہ ہیں۔ اور اب تو وہ غالباً اس خاکسار کو اس قابل سمجھنے لگیں گی کہ پولیس کے حوالے کر دیں۔ یا گھر سے نکال دیں یا کم سے کم ہمیشہ کے لیے سچ بولنے کی اس پاداش میں ناقابلِ اعتبار سمجھنے لگیں۔

سچ بولنا دنیا میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ تمام دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے مصیبت میں آپ ان ہی کو مبتلا پائیں گے جو سچ بولنے والے گذرے ہیں۔ قانون ان ہی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے جھوٹ بولتے رہیئے۔ دھوکے دیتے رہیئے۔ بے ایمانیاں کیے جائیے۔ مگر سب کو مطمئن رکھیئے کہ آپ نے کچھ نہیں کیا ہے سب مطمئن رہیں گے۔ زندگی بھر کی ایمانداری کے بعد ایک بے ایمانی کر دیجئے مقدمہ چل جائے گا۔ سزا ہو جائے گی۔ چور چوری کر کے بھاگ جاتا ہے اور شاہ بنا پھرتا ہے۔ ساہوکار کے حساب میں ذرا سی غلطی ہو جاتی ہے خیانت میں پکڑا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ اگر دنیا کے اصول کو دیکھا جائے۔ تو اس سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے۔ کہ ہم اپنی کمزوریوں کو پیش کر دیں۔ اب یہ کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا کہ خدا نے اس کو سچ بولنے کی توفیق عطا کی۔

کوئی کہے گا۔ سن لیا آپ نے یہ جو آپ کے شوکت تھانوی ہیں اعلیٰ درجے کے جواری واقع ہوئے ہیں۔"

کسی طرف سے آواز بلند ہوگی "بدمعاشیوں کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں"۔ کوئی صاحب فرمائیں گے "بے حیائی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو کہ کس صفائی سے اپنا اعمالنامہ پیش کیا ہے"۔

کوئی بڑے شاعرانہ انداز سے کہے گا۔ "چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد"۔

اور بیوی اپنے پھوہڑ ہوئے رخ روشن پہ اپنے آنسوؤں کا انتظار کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہیں گی "واہ ری قسمت! شکر ہے خداوند تیرا" یہ سب ہیج پوچ لینے کے سلسلہ میں ہوگا۔ ہیچ پوچ لینے کی کوشش نہ کرتے تو کیسے اچھے رہتے۔ لکھنے والے نہایت ادب سے "مولانا شوکت تھانوی" لکھ لیتے حالانکہ مولانا نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ زندگی میں دس پانچ ہی سالم روزے رکھے ہونگے۔ چہرے پر سوائے ایک سال کے کبھی داڑھی بچی نہیں رہی۔ اور نہ سنجیدگی سے کبھی کوئی کام ایسا کیا جو خالص خدا کیلئے کہا جا سکے۔ لوگ حضرت شوکت تھانوی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کو معلوم نہیں ہے کہ یہ شوکت تھانوی بڑے حضرت ہیں۔ بیوی بہت زیادہ تو خیر خوش نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جو کچھ ان کے علم میں ہے۔ اسی کو وہ بدنصیبی کے لیے کافی سمجھتی ہیں مگر ان کا شوہر ہیچ نہ بولتا۔ تو وہ اپنے کو اتنا ہی بدنصیب سمجھتی رہتیں۔ اور اب تو ان بیچاری کی بدبختیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہے گا۔ اس لیے کہ ان کے شوہر میں اور تو

سب عیب تھے ہی یہ کمبخت تو چور کے علاوہ سینہ زور بھی نکلا۔ بے شرمی کی حد کر دی سب کچھ لکھ کر چھاپ دیا کہ وہ بیوی جلتی ہو تو جی کھول کر جلو تم ہمارا کر ہی کیا سکتی ہو ہم نے جو کچھ کیا خوب ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ یہ کیا۔ یہ کیا اور یہ کیا۔

ان تمام حالات کے ماتحت سچ بولنے کی جرأت کرنا خودکشی نہیں تو اور کیا ہے۔ گاندھی جی کو تلاش حق تھی۔ اور یہاں تلاش شامت ہے۔ ان کا کیا ہے وہ تو جہاں تھے اپنے حالات لکھ کر اس سے بھی کچھ اونچے ہو گئے۔ مگر ہم دنیا کی نظروں سے اپنے کو گرانے کے لیے اپنے عقیدت مندوں میں بدعقیدگی پھیلانے کیلئے۔ دوستوں سے دشمنی مول لینے کیلئے اور دشمنوں کی دشمنی مستحکم بنانے کیلئے یہ تمام سامان کر رہے ہیں۔ اپنے عزیز شرمائیں گے کہ لاحول ولا قوۃ اس ننگ خاندان نے تو ناک ہی کاٹ لی۔ احباب پچھتائیں گے کہ توبہ ہے اس کمبخت سے کیوں میل جول رکھا۔ ہمارے لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والے بددل ہوں گے کہ یہ تو بڑا تھرڈ کلاس انسان ثابت ہوا۔

پر سب کچھ گوارا ہے۔ مگر اب زندگی کا اعتبار روز بروز اٹھتا جاتا ہے کنپٹی کے اوپر اور ناک کے عین نیچے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں۔ قلب کی شکایت روز افزوں ترقی پر ہے۔ عینک کا نمبر بڑھتا جاتا ہے۔ یہ سب آثار ہیں وہاں پہنچنے کے اور حال یہ ہے اب تک دنیا کسی طرح چھوٹتی ہی نہیں نہ روزہ نہ نماز۔ سوائے مصیبت کے کسی وقت خدا کا نام بھی زبان پر نہیں

اب اگر خدا نے یہ توفیق دی ہے کہ کم سے کم اپنی لغزشوں کا اعتراف ہی کر لیں تو اس توفیق سے دنیا والوں کے ڈر کے مارے ہم آخر کیوں باز رہ جائیں۔ ہم اگر سچ بولنے کے بعد قابلِ نفرت ثابت ہوتے ہیں تو یہ قصور ہمارا نہیں بلکہ اس سچ کا ہو گا جس سے اب تک بچنے کی ہم نے ایمانداری کے ساتھ پوری کوشش کی مگر آخر کار ؎

وہ ہرے گئے دِل خانہ خراب کے بدلے

ہماری آپ بیتی کا یہ پہلا حصّہ ہے، جو اپنی زندگی کے اس دور پر ختم ہو جاتا ہے جس کا تعلق اخبار نویسی سے رہا۔ شروع شروع میں خیال یہ تھا کہ شاید خُدا نے ہمارا رزق قلم ہی کے بہانے اتارا ہے۔ اور زندگی بھر ہم کو کاغذ ہی پر روٹی ملے گی۔ ... مگر ۱۹۳۸ء کے وسط میں زندگی کا دوسرا دَور شروع ہو گیا۔ اور اب گانے بجانے سے روٹی ملنے لگی۔ ریڈیو کی ملازمت کی بجائے پلی آرٹ پکچرز میں گئے، سونگ پبلسٹی میں آئے مگر ابھی چونکہ یہ دور نا تمام ہے اور معلوم نہیں ابھی قسمت میں اور کیا کیا لکھا ہے لہٰذا ہم اپنی رام کہانی اخبار نویسی کے دور کے اختتام تک فی الحال پیش کر رہے ہیں۔ "نابدولت" کے بعد دوسرا حصّہ اس جانب ابھی پیش ہونے والی چیز نہیں بلکہ اس کو ہم برابر مرتب کرتے رہیں گے۔ اور غالباً وہ اس وقت پیش ہو سکے گی، جب پیش کرنے والا دُنیا کی جوابدہی کے بجائے کسی اور جوابدہی میں مبتلا ہو گا۔

اس کے بعد میں نے کوشش کی ہے کہ تمام موٹے موٹے واقعات سامنے آ جائیں چھُپانے اور دبانے کی کوشش محض اِن واقعات کے سلسلہ میں کی گئی ہے

جن سے ہمارے علاوہ کسی اور کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے تو خیر اوکھلی میں سر ڈال ہی دیا ہے مگر گیہوں کے ساتھ گھن کیوں پسیں۔ لہٰذا اس قسم کے واقعات اگر بیان بھی کیے ہیں تو فریقِ ثانی کا نام لیے بغیر ظاہر کیے ہیں۔ اس لیے کہ روشنی میں ہم خود آنا چاہتے ہیں کسی اور کی لغزشوں پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہم سے کوئی شکایت پیدا ہو تو ہم نہایت شرافت کے ساتھ معذرت خواہ ہونے کی پوری کوشش کریں گے۔

ادارۂ فروغِ اردو لاہور کے مالک محمد طفیل صاحب اس وقت بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ آپ کا اس خاکسار کے متعلق جو کچھ بھی خیال ہے اس کو تو آپ ہی جانتے ہوں گے۔ مگر آپ اس نیاز مند سے کام لیتے ہیں ٹائپ رائٹر کا اور خیال آپ کا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ لاہور سے آ کر محض آپ کا یہ کہہ کر بیٹھ جانا ہی کافی ہوتا ہے کہ اے ٹائپ رائٹر لکھ دے ایک کتاب جلدی سے چنانچہ آپ بیٹھے رہتے ہیں اور ٹائپ رائٹر لکھتا رہتا ہے۔ یہ کتاب بھی آپ نے اس ٹائپ رائٹر سے اسی طرح لکھوائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے متعلق ہمارے ذہن میں کچھ نوٹ پہلے سے تیار تھے مگر ان کو تحریری شکل میں ترتیب کے ساتھ لانا اور وہ بھی اس صورت میں کہ پاسبانِ عقل کسی وقت بھی دل کو تنہا نہ چھوڑے ایک عجیب قسم کی سزا ہے۔ گرمیوں میں کوئی تحریری کام کرنا یوں بھی بدمذاقی کی دلیل ہے مگر ہم نے بھی اسی زمانہ میں یہ حالات اسی وجہ سے

قلمبند کر دیے اگر ان میں کسی خوش مذاق کا بھی امکان مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے
اب معلوم نہیں طفیل صاحب اس کتاب کے ساتھ کیا سلوک کریں گے
مگر استدعا ہم اُن سے یہی کر رہے ہیں کہ۔ ع۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے اُٹھے

لکھنؤ۔ ۲۰ر جون ۱۹۴۵ء

شوکت تھانوی

پیدائش وغیرہ

کتنی سچی بات کہی ہے جس کسی نے بھی کہی ہے کہ ہر زمانہ میں اور دنیا کے ہر گوشہ میں ایک قطب اور ایک احمق ساتھ ساتھ پیدا ہوا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر ملک میں ایک قطب اور ایک احمق ہوتا ہے یعنی اس پایہ کا قطب جس کی قطبیت کو تمام ملک تسلیم کر لے اور احمق بھی اس پایہ کا جس کی حماقت کے سامنے تمام ملک کے احمق سر تسلیم خم کر دیں۔ اسی طرح ہر صوبہ کا ایک قطب ہوتا ہے ایک احمق۔ پھر ہر شہر کا ایک قطب اور ایک احمق یہاں تک کہ ہر محلہ کا ایک قطب اور ایک احمق۔ اور اکثر تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر میں ایک بھائی قطب ہوتا ہے تو دوسرا احمق۔ دونوں اپنی اپنی جگہ مسلّم ہوتے ہیں اور دونوں کا حلقۂ اثر جدا گانہ ہوتا ہے

اب ذرا اس کلیہ کی صداقت ملاحظہ ہو کہ کہاں کرشن مراری اور کہاں ایک ادبی مداری، زمانہ ایک نہ سہی مگر مقام ایک ہی ہے۔ کرشن کا استھان بندرابن ضلع متھرا جنم بھومی بنتا ہے کس کی؟ ... شوکت تھانوی کی ... یہ ایک تاریخی لطیفہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا واقعہ ہے۔ بندرابن کے کوتوال صاحب منشی صدیق احمد صاحب مرحوم جو پہلے تو اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے مگر شادی کے بارہ سال بعد اولاد ہوئی بھی تو لڑکی اب اولاد کی تمنا تو پوری ہو گئی۔ مگر ہمارے بزرگ لڑکی کو نصف اولاد سمجھا کرتے تھے۔ جس طرح لڑکی کا شوہر آج بھی اس کو نصف بہتر سمجھنے کا قائل ہوتا ہے۔ منشی صدیق احمد صاحب اس طرح نصف صاحب اولاد ہو کر اپنی نصف بہتر کے $\frac{1}{2}$ قائل ہو سکے اور اپنے ارمان کی تکمیل کے لیے پھر چار سال تک بیچارے کو انتظار کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲ فروری ۱۹۰۴ء کو صبح ہونے سے قبل ہی ان کی یہ تمنا بھی پوری ہو گئی۔ اور اولاد نرینہ سے بھی ان کی نصف بہتر کی گود پر ہو گئی۔ سپاہیوں نے گولے داغے۔ بھانڈوں نے ڈھول بجائے۔ نٹوں نے کرتب دکھائے ایک ہفتہ تک چہل پہل رہی۔ لوگوں نے اس ولادت کو وہ اہمیت دی گویا دنیا میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا ہے۔ بچے پیدا ہی ہوتے رہتے ہیں مگر کوتوال شہر کا بچہ ہمیشہ پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہمیشہ پیدا ہو تو ہمیشہ یہی دھوم دھڑکے ہوتے ہیں۔ کوتوال صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع اگر خود ان ہی کے گھر میں پیدا ہو جائے۔ تو اس سے

بڑھ کر اور کیا چاہیئے۔ جس کو دیکھیئے بچّے کو دیکھنے اور کوتوال صاحب کو مبارکباد دینے کے لیے چلا آرہا ہے۔ کہیں سے چھٹی آرہی ہے، کہیں سے ناوج رنگ کے ساتھ بدھاوا، کہیں سے کرتے ٹوپی اور کہیں سے محض مٹھائی۔ کوئی کہتا ہے کہ کوتوال صاحب بچّے کا نام آپ "بندرابن داس" رکھ دیجیئے۔ ایک فارسی پنڈت جی نے بڑی قابلیت سے فرمایا کہ "صاحبزادے کا شیخ اسم شیام بن صدیق رکھ دیجیے۔" مگر عقیقہ کے دن نام رکھا گیا "محمد عمر" اور تاریخی نام نکلا "تسخیر احمد"، یہ ان ہی حضرت کا نام اور تاریخی نام ہے جن کو اب شوکت تھانوی کہا جاتا ہے تھانوی اس لیے نہیں کہا جاتا کہ پیدائش بندرابن کے تھانہ میں ہوئی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اس خاندان کا وطن ہے۔ اور ہر چند کہ اب اس خاندان کے افراد خانہ بدوش نظر آتے ہیں۔ مگر تھانہ بھون کے محلّہ محلت میں آج بھی جتنے ٹوٹے پھوٹے مکانات ہیں وہ اسی خاندان کی الوالعزمی کے مزار سمجھے جاتے ہیں۔

بیہوشی کی باتیں

پیدائش سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب تک کہ بچّہ ہوش نہ سنبھالے دراصل اس کی ذاتی زندگی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حیثیت ایک کھلونے کی ہوتی ہے۔ جس سے اس کے والدین جس طرح ان کا جی چاہتا ہے کھیلتے ہیں۔

اور سمجھتے یہ ہیں کہ بچہ کھیل رہا ہے حالانکہ بچے کا ہر کھیل خود ان کا کھیل ہوتا ہے اور بچے کی آڑ میں بچے سے زیادہ یہ خود کھیلتے ہیں۔ میں اپنے اس زمانہ کو اپنا ذاتی زمانہ نہیں بلکہ روایتی زمانہ کہہ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ اُس دور کی کوئی بات بھی مجھے یاد نہیں۔ البتہ اُس دور کی کچھ روایتیں سُنی ہیں جن میں سے چند قابلِ ذکر ہیں اور اِن کو اجمالی طور پہ بیان کر کے میں اس دور سے گذر جانا چاہتا ہوں۔ سُنا ہے کہ میرا یہ زمانہ زیادہ تر بیماریوں میں گذرا۔ والد صاحب کی رشوت کی تمام آمدنی ڈاکٹروں کی فیس اور دواؤں کی قیمت میں صرف ہو جاتی تھی۔ مالِ حرام بجائے حرام کیونکر صرف نہ ہوتا۔ ضعفِ معدہ کی شکایت اس قدر شدید تھی۔ کہ ڈاکٹروں نے غذا پر نہایت سخت پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ سُنا ہے کہ اس زمانہ میں ہم کو کھانے کے وقت کا نہیں بلکہ والد صاحب کے کھانے کے وقت کا انتظار رہتا تھا۔ تا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد انگلیاں ہم کو چٹا دیں۔ یہ واقعہ ہے اس وقت کا جب عمر غالباً سات سال تھی اور اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری شاعری کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ ہم نے پہلا شعر اسی فاقہ مستی سے متاثر ہو کر اسی عمر میں کہا تھا۔ حالانکہ اُس وقت نہ گھر میں شعر و شاعری کا چرچا تھا نہ کسی قسم کا کوئی ادبی ماحول۔ مگر شاعری اور فاقہ مستی میں جو چولی دامن کا ساتھ ہے وہ یہاں بھی کار فرما ہوا اور سات سال کے اس فاقہ مست نے غیر شعوری طور پر ایک مطلع عرض کیا۔ ملاحظہ ہو۔

نہ وانا نہ پانی نہ کہیں سے کمک
اے میرے اللہ میں اب کیا کروں

روایت ہے کہ ایک سینٹھے میں کپڑا لپیٹ کر ہم گویا علم بناتے تھے اور یہ علم اسی مرثیہ کے ساتھ اٹھاتے تھے۔ اور پھر زور و شور سے ماتم ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں والد صاحب کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ اور لکھنؤ میں بچوں کا علم اٹھانا یا مرثیہ پڑھنا کوئی عجیب بات نہیں دن رات وہ یہی دیکھتے رہتے ہیں۔

ہوش کی باتیں

میری زندگی کا وہ دور جس پر میں خود روشنی ڈال سکتا ہوں۔ بھوپال سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں والد صاحب کی خدمات یو۔پی۔ پولیس سے حاصل کی گئی تھیں اور آپ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے عہدہ پر فائز تھے۔ میں نے اپنے ہوش کی آنکھیں بھوپال کے ایک عالیشان مکان میں کھولیں۔ باہر ایک پورا پولیس گارد پہرہ پر رہتا تھا اندر ہمارا پورا خاندان۔ کئی کئی ملازم ہمارے ساتھ کھیلنے کے لیے ماموں کے بچے ناز برداری کے لیے ماں باپ سے لے کر دور اور قریب کے رشتہ دار بلکہ آئے گئے تک سب بڑے لاڈ پیار میں زندگی کے دن گذر رہے تھے کہ معلوم نہیں کس نے والد صاحب کو یہ مشورہ دے دیا کہ لڑکے کی تعلیم شروع ہونا چاہیے۔ اور آخرکار ایک ماسٹر صاحب بلائے گئے معلوم ہوتا تھا بندر کا

تماشہ شروع کریں گے۔ ویسی ہی سر پہ پگڑی، ویسی ہی الجھی ہوئی داڑھی، ہو بہو گڈی نما چہرہ معلوم نہیں وہ خود بھی کچھ پڑھے لکھے تھے یا نہیں بہر صورت ہمارے لیے ان سے بہتر معلم بھوپال میں گویا کوئی اور نہ مل سکا۔ ان حضرت نے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈروں کو رٹانا شروع کیا مگر کچھ ہی دن پڑھا سکے تھے کہ ایک دن والدہ صاحبہ نے ان کو پڑھاتے ہوئے کسی لفظ کے غلط تلفظ پر جو غور کیا تو اسی دن ماسٹر صاحب کا حساب کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور ماسٹر آئے جو چوتھے دن اس لیے نکال دیئے گئے کہ وہ ذرا سخت قسم کے آدمی تھے اور مار پیٹ میں ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ ہماری والدہ کی پرسنل اسسٹنٹ بوا جعفری خانم نے جو ہمارے حق میں گویا مشیر تعلیمات بھی تھیں والدہ سے کہا کہ "اے ہے موئے ماسٹر کو صدقے کر دوں اپنے بچے پر سے بگوڑے کی صورت دیکھ کر ننھا سا کلیجہ دہل جاتا ہے۔ بیوی اس موئے کا تو آج ہی حساب کر دیجئے" چنانچہ ان بیچارے کا فوراً حساب کر دیا گیا۔ اب ایک اور ماسٹر صاحب آئے۔ جن کا اسم مبارک میر امجد علی تھا۔ بوٹا سا قد۔ ناک کی پھنگی پر دھری عینک، منہ میں کچھ دانت اور باقی پان جیب میں گھڑی اور گھڑی کی زنجیر میں لٹکا ہوا قطب نما۔ اس وقت بھی ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ اسی زمانہ میں ایک جوتے کی پالش بہت چالو تھی جس کی شیشی پر بلی کا چہرہ ہوتا تھا۔ ہمارے یہ ماسٹر صاحب بالکل اسی بلی کی شکل کے تھے اور مزاج تو ایسا لاجواب پایا تھا کہ خدا ہر طالب علم کو ایسا ہی ماسٹر عطا

فرمائیے۔ سبق یاد کیا یا نہ کیا اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ نیا سبق چاہے پڑھو جی چاہے نہ پڑھو۔ ماسٹر صاحب کو مارنے کے لیے دل چاہے تو بھی ماسٹر صاحب خوش بلکہ اگر اپنے جیب خرچ سے کچھ پیسے ماسٹر صاحب کو دے دو تو جاؤ چھٹی۔ عالم یہ تھا ہمارے ان ماسٹر صاحب کا کہ تشریف لائے اندر سے ان کے لیے چائے آگئی۔ وہ نوش فرمائی، پان آگئے وہ منہ میں رکھ لیے اور پھر کتاب سامنے رکھ کر ہم لگے پڑھنے اور وہ لگے اُونگھنے۔ کبھی کبھی اُونگھتے اُونگھتے ایک نعرہ بلند کیا آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ اور پھر اونگھ گئے۔ اگر وہ بالکل سو گئے تو ہم نے اُن کے چہرہ پر روشنائی سے کچھ گل بوٹے بنا دیئے۔ اور اگر وہ جاگتے رہے تو ہم سلیٹ پر مرغے کی تصویر بناتے رہے۔ اور منہ سے بکتے رہے آر۔ اے۔ ٹی ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا۔ کچھ دنوں کے بعد یہ تکلف بھی اُٹھ گیا اب تک تو ماسٹر صاحب کی گت محض اس وقت بنتی تھی۔ جب وہ اونگھتے تھے مگر اب جاگتے ہوئے ماسٹر صاحب کے ساتھ بھی دھول دھپا شروع ہو گیا۔ حالانکہ یہ سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا۔ مگر ہم ہی کر بیٹھے تھے پیش دستی ایک دن۔

ماسٹر صاحب میں یہ بڑی خوبی تھی کہ ان کو پیسے دے دیجئے اپنے حصے کی مٹھائی کھلا دیجئے اس کے بعد ان کی جو گت چاہے بنا لیجئے۔ کیا مجال جو منہ سے اُف بھی کر جائیں۔ مگر فلک کج رفتار کو ہمارا یہ سوراج پسند نہ آیا۔ اور ایک دن والد صاحب نے نہایت حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ صاحبزادے اپنے ماسٹر سے

آنکھ موچی وجب کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ ماسٹر صاحب دوسرے ہی دن ہٹائے گئے۔ اور پھر زندگی بھر ہم کو ان کا نعم البدل نہ مل سکا۔

الگزنڈرا ہائی اسکول

بھوپال میں اس وقت دو ہائی اسکول تھے۔ ایک الیگزنڈرا ہائی اسکول اور دوسرا جہانگیریہ ہائی اسکول۔ الیگزنڈرا ہائی اسکول صاحبزادگان بلند اقبال کا اسکول سمجھا جاتا تھا۔ اور جہانگیریہ ہائی اسکول بندہ زادوں کی تعلیم گاہ تھی۔ الیگزنڈرا ہائی اسکول کے ٹھاٹھ ہی کچھ اور تھے۔ طالب علموں کے لیے وردی ضروری تھی۔ سیاہ شیروانی اور آسمانی صافہ، عمارت بڑی پر تکلف، سامان سب قیمتی، مختصر یہ کہ ان دونوں ہائی اسکولوں میں اس وقت یہ کھلا ہوا امتیاز تھا۔ گویا ایک دار الامراء ہے۔ اور دوسرا دار العوام۔ والد صاحب نے لوگوں کے کہنے سننے میں آکر آخر ہمارا داخلہ الگزنڈرا ہائی اسکول کے (INFANTS CLASS) جماعت اطفال میں کرا دیا۔ اب ہم سیاہ شیروانی اور نیلے صافے میں ایک سپاہی کے ساتھ الیگزنڈرا ہائی اسکول جانے لگے۔ دوپہر کو ایک دوسرا سپاہی ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا تھا۔ اور ہم پڑھتے کیا تھے اسکول میں بھی گڑیاں کھیلتے تھے۔ اس زمانہ کے اپنے کسی ماسٹر کا نام ہم کو یاد نہیں رہا۔ البتہ اپنے دو ہم جماعتوں کا نام ابھی یاد ہے۔ اور حلیہ بھی ذہن میں محفوظ ہے ایک کا نام مظفر تھا اور

دوسرے کا منو میاں ہماری دوستی ان دونوں سے اس قدر بڑھ گئی کہ کچھ دنوں کے بعد جب ہماری استعداد کا اندازہ کرنے کے بعد درجہ چڑھانے کی رائے ہوئی تو ہم نے رونا شروع کر دیا۔ ماسٹر حیران تھے کہ آخر ماجرا کیا ہے ترقی پر رونے کا کون سا موقع ہے مگر ہم نے صاف انکار کر دیا کہ مظفر اور منو میاں کو چھوڑ کر ہم ترقی پر نہ جائیں گے۔ قصہ در اصل یہ ہے کہ ترقی کا تصور ہی ہمارے ذہن میں نہ تھا۔ اور نہ تعلیم کی سنجیدگی سوائے اس کے کبھی ہم سمجھ سکے کہ ہم کو کھیل سے روکنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ کہ پڑھنے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ عقلمند بھی کافی تھے۔ اُسی زمانہ کا ذکر ہے کہ سید لیاقت علی صاحب کا (جو اب سر سید لیاقت علی ہیں) سامان ہمارے یہاں امانتاً رکھوایا گیا اس لیے کہ سر لیاقت علی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن بریلی تشریف لے جا رہے تھے۔ والد صاحب نے ہم سب کو جمع کر کے نہایت سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اس سامان کی کوئی چیز ہم لوگ ہرگز نہ چھوئیں۔ حالانکہ اس سامان میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کو نہ چھونا کفرانِ نعمت کا درجہ رکھتا تھا۔ مگر اب تو ممانعت ہو ہی گئی تھی کرتے تو کیا کرتے۔ پھر بھی اُس دن جب یہ اطمینان ہو گیا کہ والد صاحب اب دوپہر کا کھانا کھا کر سو گئے ہیں اور اگر ہم ان چیزوں کو چپکے سے چھو بھی لیں تو ان کو اطلاع نہیں ہو سکتی۔ ہم نے چپکے چپکے ایک ایک چیز کو چھونا شروع کیا۔ گھومنے والی کرسی کو چپکے سے

نچایا جھونے والی کرسی پہ بیٹھ کر جھولے۔ الماری کے اندر بند ہوکر یہ فیصلہ کیا۔ کہ اس سے چور اور شاہ کے کھیل میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ مختلف چیزوں کا معائنہ کرتے ہوئے ایک بڑی خوبصورت سی گھڑی کو جو ہم نے چھوا اور اس کے کل پرزوں کا جو جائزہ لیا تو اس کمبخت نے ایک دم شور مچا دیا۔ اور لگی اس کی گھنٹی بجنے اب لاکھ لاکھ اس کے آگے .... ہاتھ جوڑتے ہیں۔ توبہ کرتے ہیں، کان پکڑتے ہیں۔ مگر وہ نہ اب چپ ہوتی ہے نہ جب۔ کرتے کے دامن میں اسے چھپایا۔ الماری کے اندر اسے بند کرنے کی کوشش کی۔ اور آخر عین اس وقت جب کہ ہم اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ اور وعدہ کر رہے تھے کہ اب تم سے نہ بولیں گے، دیکھتے کیا ہیں کہ والد صاحب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ انہوں نے بہت پیار سے ہم کو بلا کر کہا۔

"دیکھ لیا تم نے چوری کبھی نہیں چھپتی اور جو بڑوں کا کہنا نہیں مانتے ان کا بھانڈا اسی طرح پھوٹتا ہے۔ اچھا اب کبھی ان پرائی چیزوں کو نہ چھونا۔"

گھڑی نے اس بری طرح چغلی کھائی تھی کہ ہم واقعی سہم کر رہ گئے تھے۔ اور اس کے بعد ہم نے وہ سامان پھر کبھی نہیں چھیڑا۔ مطلب کہنے کا یہ کہ الارم کو گھڑی کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر بند کرانے کی کوشش کرنے والا عقلمند اسکول میں ترقی ملنے پر اگر رو دیا تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ مگر یہ ترقی زبردستی ہمارے سر منڈھی گئی اور ہم کو درجہ اوّل میں جانا پڑا۔ الگزنڈرا ہائی اسکول میں ہمارا بہت کم زمانہ

گذرا۔ اس لیے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت ترک کر دی اور ہم لوگ لکھنؤ آ گئے۔ اس اسکول کی پڑھائی اور اس کے ماحول وغیرہ کے متعلق ہم کوئی مستقل رائے قائم کرنے کے قابل ہی نہ تھے۔ اور نہ کوئی رائے قائم کر سکے۔ البتہ اتنا ہم کو اب بھی احساس ہے۔ کہ اسکول کی تعلیم یا پرائیویٹ ٹیوٹروں کی تمام جدوجہد سے زیادہ ہم پر اثر اس تربیت کا ہو رہا تھا۔ جو بھائی جان مولانا ارشد تھانوی کی طرف سے ہم کو حاصل ہو رہی تھی۔ ہمارے ذہن میں نہ معلوم یہ کیوں جم گیا تھا کہ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی معراج یہ ہے کہ وہ بھائی جان کا ایسا ہو جائے۔ ارشد صاحب ہمارے حقیقی چچازاد بھائی ہیں۔ اور ان کے والد ہمارے بڑے ابا اُس زمانہ میں بھوپال ہی میں وکالت کرتے تھے۔

بھائی جان کو ہم نے اپنے لیے ایک معیار بنا لیا تھا۔ وہ سوٹ پہنتے تھے ہمارا جی چاہتا کہ ہم بھی سوٹ پہنیں۔ وہ بڑے ٹھسے سے چاء پیتے تھے۔ ہزاروں نخروں کے ساتھ کہ پانی زیادہ جوش کھا گیا ہے۔ پتی کم رہ گئی ہے۔ دودھ میں یہ نقص ہے کہ بھینس نے غالباً حفظانِ صحت کے اصولوں کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ چارہ کھا لیا ہے۔ جس میں وٹامن کی کمی تھی۔ ہم ان تمام باتوں کو سنتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ سمجھ بوجھ ہم میں بھی پیدا ہو جائے۔ کہ دودھ کو چکھ کر بھینس کے مشاغل کا اندازہ کر لیا کریں۔ بھائی جان کے ادبی مشاغل کا رعب بھی قائم تھا۔ ہم ان کے ساتھ ان کے دوستوں کے یہاں جایا کرتے تھے۔ اور وہ جو باتیں کرتے تھے ان کو ہم ذہن

میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔

اخبار پھول

اسی زمانہ میں بھائی جان نے ہمارے نام لاہور کا اخبار پھول منگانا شروع کر دیا۔ اور یہ اخبار ہماری تمام اسکولی کتابوں سے زیادہ ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ اخبار پر ہمارا اپنہ اور چھپا ہوا نام یہ وہ باتیں تھیں جن کو دیکھ دیکھ کر ہم کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ کہ ہم بھی وہ ہیں جس کا نام چھپا ہوا اخبار پر لیبٹ کر اس طرح آتا ہے۔ اخبار کی کہانیاں پڑھ کر گھر بھر کو سنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اخبار کا ایک ایک پرچہ بڑی احتیاط سے رکھا کرتے تھے۔ اب بھائی جان نے ایک نئی ترکیب کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں خود لکھتے تھے اور ہمارے نام سے پھول میں چھپنے کو بھیج دیا کرتے تھے۔ اب تو ہمارا پوچھنا ہی کیا مضمون نگار ہو گئے تھے۔ اپنے نام سے چھپی ہوئی کہانیاں سب کو دکھاتے پھرتے تھے۔ در اصل ادبی ذوق اسی وقت بھائی جان نے معلوم نہیں جان بوجھ کر یا غیر ارادی طور پر ان صورتوں سے ہم میں پیدا کیا تھا جس کو بعد میں وہ دوسری صورتوں سے ابھارتے رہے مگر ان کو یہ خیال کبھی بھی نہ تھا کہ یہی ذوق اس لڑکے کا مستقبل بن جائے گا۔ وہ بیچارے بجی طور پر ادیب اور شاعر سب ہی کچھ تھے اور باضابطہ طریقہ پر وکیل اور کورٹ انسپکٹر وغیرہ تھے۔ اخبار پھول کے لیے ہم کو یاد نہیں پڑتا۔ کہ خود ہم نے بھی کچھ لکھا ہو۔ مگر

پھول سے اپنی دلچسپی ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔ کیا مجال کہ پھول کا کوئی پرچہ ذرا سا بھی میلا ہو جائے یا کوئی کہیں اٹھا کر لے جائے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ ان حضرت کی اولاد ہے تو یہی اخبار، اور جائداد ہے تو یہی اخبار۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس طرح بچے اپنی کتابوں پر اپنا نام لکھتے پھرتے ہیں ہم نے کبھی اپنے اخبار پھول پر اپنا نام بھی نہیں لکھا کہ اخبار خراب ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ ہم اپنی سب سے بڑی درسی کتاب اسی اخبار پھول کو سمجھتے تھے۔

حجامت

ہمارے نام پھول آتا تھا اور باجی اظہور فاطمہ جواب خاتون ارشد ہیں ان کے نام تہذیب نسواں۔ ہم کو تو تہذیب نسواں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ مگر ان کی تربیت کبھی کبھی پھول کے لیے ڈاواں ڈول ہوا کرتی تھی۔ اور یہ بات ہم کو پسند نہ تھی وہ ہماری عدم موجودگی میں پھول کے ترتیب سے رکھے ہوئے پرچے بے ترتیب کر دیا کرتی تھیں۔ اور ہم اکثر اس بات پر ان سے لڑا کرتے تھے۔ غالباً اسی قسم کی کسی بات پر ایک دن ہم خفا تھے۔ اور وہ ہم کو منا رہی تھیں کہ ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کس قدر سخت بال ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے سؤر کے بال۔ ہم یہ سن کر پہلے تو چپ ہو گئے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد قینچی لا کر ان کے لمبے لمبے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ کاٹ ان کو دیتے ہوئے کہا۔ "لو یہ ریشم کی لچھی

بڑی آفت مچائی بڑی شکایت کی۔ مگر ہم نے کہہ دیا کہ سور کے بالوں کا جواب یہی تھا کہ بیشجر کی لچھی پیش کر دی جائے۔

لکھنؤ

۱۹۱۴ء میں والد صاحب نے بھوپال کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر بجائے تھانہ بھون جانے کے لکھنؤ کا رخ کیا لکھنؤ سے ان کو سوائے سسرالی دلچسپی کے اور کوئی دلچسپی نہ تھی ممکن ہے وطن سے اس لیے بھی دور رہنا پسند کیا ہو کہ خارِ وطن اسی وقت تک سنبل و ریحان سے خوشتر محسوس ہوتا ہے۔ جب تک کہ انسان غربت میں اس کا تصور کرتا رہے۔ لیکن جب غربت سے وطن پہنچ کر اس خارِ وطن کو آزمانے کی کوشش کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے۔ کہ خار تو خار یہاں تو سنبل و ریحان سب میں خلش موجود ہے۔ میرے دوست وصل بلگرامی کے نام سے ایک شعر مشہور ہے کہ ؎

ان کی گلی کا راستہ حرفِ طلسم راز ہے

دور سے پاس پاس تھا پاس سے دور دور تھا

وطن جس قدر غربت میں پیارا معلوم ہوتا ہے اسی قدر قربت میں اس کی محبت اور کشش ختم ہو جاتی ہے وطن اور اعزہ سے محبت کو برقرار رکھنے کے لیے بہت ممکن ہے کہ والد صاحب نے لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا ہو۔ حالانکہ مشہور یہی تھا کہ سسرالی

کی محبت پر گھر کی محبت کو قربان کر دیا تھانہ بھون کی مٹی لکھنؤ کی خاک کا پیوند بنی۔ بہر حال کچھ بھی ہو۔ والد صاحب نے ذاتی مکان بھی یہیں بنوالیا اور بھوپال سے واپسی پر اسی عروس البلاد کی رنگینیوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ لکھنؤ میں ہمارے ماموں حکیم محمد یوسف صاحب رہتے تھے حالانکہ ان کے بال بچے سب ہم لوگوں کے ساتھ بھوپال میں تھے اور وہ نہ جانے کیوں اس جمع غائب کے باوجود لکھنؤ میں واحد حاضر رہے۔ لکھنؤ بھی ہم دراصل اس وقت آئے جب ہوش تو آچکا تھا۔ مگر آدمیت سر سے غائب تھی اور اگر سچ پوچھئے تو باقاعدہ تعلیم اب تک شروع ہی نہ ہوئی تھی۔ والد صاحب اس سلسلہ میں بلا کے بے پرواہ، والدہ صاحبہ بے چاری گھر کی بیٹھنے والی۔ لاکھ چاہا کہ لڑکے کو کسی اچھے استاد کے سپرد کر کے کسی معقول اسکول میں بھیج دیں۔ مگر بس اتنا ہی چلا کہ حضرت مولانا عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ فرقانیہ میں بھیج دیا۔ جہاں قرآن مجید کی تعلیم شروع ہو گئی۔ مگر پڑھائی سے زیادہ بُرے لڑکوں کی بُری صحبت کے اثرات ہم نے قبول کرنا شروع کر دیئے۔ نہایت بڑی بڑی گالیاں سبق سے زیادہ یاد کر لیں۔ بغل بجانے کے کرتب سیکھے، سڑک پر کھڑے ہو کر مداریوں کے تماشے دیکھنے لگے مدرسہ جانے کے لیے گھر سے چلے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کے لیے اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی میدان میں پہنچ گئے۔ بازار سے چاٹ کھانے اور پتنگے چاٹنے لگے۔ مختصر یہ کہ اس مدرسہ میں جو تربیت حاصل کی۔ اس کے بعد ہم اسی قابل رہ گئے تھے کہ یکہ ہانکتے یا کباب پہ اٹھے کی دکان

رکھ کر بیٹھ رہتے۔ مگر عین وقت پر والدہ محترمہ کی توجہ پھر اپنے لاڈلے کی طرف ہوئی اور آخر بیچاری نے اپنے میکے والوں۔ بیٹوں وسیلوں سے اور جو کوئی بھی ان کو نظر آیا سب ہی سے کہہ سُن کر ایک ماسٹر گھر پر رکھا۔

ماسٹر چھوٹے لال

ماسٹر چھوٹے لال صاحب لکھنؤ میں ہمارے پہلے پرائیویٹ ٹیوٹر تھے بہت اہتمام سے سر کے بالوں میں تیل لگا کر مانگ اس طرح نکالتے تھے گویا پیشانی کے اوپر دو چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں پتلی دیوار کی کشتی نما ٹوپی پہنتے تھے۔ ان کا مشغلہ صرف ٹیوشن تھا۔ صبح سے جو ٹیوشن کرنے نکلتے تھے تو شام کو گھر پہنچتے تھے نہ جانے کتنے لڑکے پڑھاتے تھے۔ بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ اور کوشش کرتے تھے کہ سُنتی نہ برتیں اور سبق یاد کرادیں۔ مگر ان کو اپنی کوشش میں کامیابی بہت ہی کم حاصل ہوتی تھی۔ ان کی محنت مُسلّم مگر شاگرد بھی کچھ معمولی قسم کا ہونہار نہیں تھا۔ بہرصورت اُن بیچارے نے انگریزی کی ایک آدھ کتاب کسی نہ کسی طرح ختم کرا ہی دی۔ اور حساب وغیرہ میں بھی اپنے نزدیک ہم کو چالو کردیا باقی مضامین بھی ٹھوس رہے ہمارے مطالعہ سے وہ بیچارے گزارتے رہے لیکن یہ امید ان کو بھی غالباً نہ ہوسکی کہ یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔ بہرصورت وہ اسی نے فیض ہی ساتھ پڑھانے کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھے کہ حضا جیرادے

پڑھ گئے تو خدا کی شان، اور نہ پڑھ سکے تو مشیت ایزدی میں کیا چارہ۔ ان کو خواہ برابر مل جاتی تھی۔ عید، بقرعید، اور شبرات کی رنگین عیدیاں ان کے زیرِ تصنیف اشعار کے کے ساتھ ہم کو ہمیشہ ملا کرتی تھیں اور ان کو ہمارے یہاں سے اس سلسلہ میں انعام ملتا تھا۔ ہمارے یہ ماسٹر صاحب شاعر بھی تھے عاصم تخلص فرماتے تھے اور اس تخلص کو عید، بقرعید، شبرات کے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ عیدیوں والے اشعار میں عاصم جڑ دیا جاتا تھا جس کے متعلق بہت دنوں کے بعد پتہ چلا کہ یہ آپ کا تخلص ہے، اور آپ صرف عیدیاں ہی نہیں کہتے کبھی کبھی مشاعروں میں غزلیں بھی پڑھتے ہیں۔ ان کی ایک عیدی کا قطعہ یاد ہے ؎

شب برات آمد بفضلِ کردگار — ہے ہر اک شاداں مثالِ نوبہار
پھلجھڑی و چرخی و انار سے — ہے زمیں کا فرش مثلِ لالہ زار

اس قطعہ میں "لالہ" بجائے خود تخلص معلوم ہوتا ہے۔ اس لالہ شاہی قطعے کے بعد اگر ان کی کسی غزل کا کوئی شعر یاد نہ رہا ہو تو غالباً اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ماسٹر صاحب کی یہ عیدیاں اس زمانہ میں بڑی دلچسپی سے والد صاحب اور ارشد صاحب پڑھا کرتے تھے اور ہماری سمجھ بالکل نہ آتا تھا کہ آخر اس میں اس قدر ہنسنے کی کیا بات ہے۔

تھانہ بھون کا پہلا سفر

اب تک ہم نے اپنا وطن بھی نہ دیکھا تھا۔ اور دیکھتے بھی کیسے جب والد

صاحب خود وطن سے کتراتے رہتے تھے لیکن ایک دن ہم کو یکایک معلوم ہوا کہ والد صاحب تھانہ بھون جا رہے ہیں۔ اور ہم کو اپنے ساتھ لے جائیں گے کچھ نہ پوچھئے خوشی کا عالم۔ مگر یہ خوشی تھانہ بھون جانے کی نہیں بلکہ محض سفر کی تھی۔ اور والد صاحب کے ساتھ سفر کرنے کی خوشی اس لیے اور بھی زیادہ ہوتی تھی کہ وہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ بہر صورت ہم تھانہ بھون پہنچے، اپنے عزیزوں کو پہلی مرتبہ دیکھا اپنے کچھ بیت دیکھے۔ اپنے گھر دیکھے۔ اسٹیشن پہ پہنچ کر تو بہت گھبرائے سکتے کہ یا اللہ یہ تو جنگل ہی جنگل ہے۔ مگر جب آبادی میں پہنچے تو تسکین ہو گئی۔ چچا میاں نے اسٹیشن پہ ڈرا دیا تھا۔ کہ تمہاری چچی بی یہاں کہیں گھاس چھیلتی ہوئی ملیں گی۔ اور ہم ایسے عقلمند کہ کچھ کچھ یقین بھی آگیا تھا۔ مگر گھر جا کر دیکھا تو چچی بی گھاس نہیں آٹو چھیل رہی تھیں۔ تھانہ بھون کے اس سفر کی کوئی ایسی بات ہم کو یاد نہیں جس کا اثر ہم پر گہرا پڑا ہو نہ وطن کے مفہوم سے ہم واقف تھے نہ وطن کی کوئی خاص محبت تھی البتہ تھانہ بھون کے پیڑے تب بھی پسند تھے اور اب بھی پسند ہیں۔

آمد نامہ

غالباً والدہ صاحبہ کے طعنوں سے تنگ آ کر یونہی اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک دن والد صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ خود ہم کو فارسی پڑھایا کریں گے۔ ہمارے لیے آمد نامہ خرید لیا۔ اور گھر کے باہر ایک میدان

میں والد صاحب نے ایک چارپائی پر یہ مکتب کھول دیا۔ ان کا قول تھا کہ کسی کو آمدنامہ پر عبور حاصل ہے تو وہ نہایت آسانی سے شیخ سعدی بن سکتا ہے۔ اور اگر کسی کو پہاڑے یاد ہیں۔ تو اس کا ڈاکٹر ضیاءالدین ہو جانا نہایت آسان ہے۔ چنانچہ وہ ہم کو شیخ سعدی اور ڈاکٹر ضیاءالدین بنانے کی فکر میں ہمیشہ رہے تعلیم کے سلسلہ میں اول تو کبھی آپ نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اور اگر کبھی باپ ہو جانے کا خیال آجاتا تھا اور اس ذمہ داری کا احساس کبھی پیدا ہو جاتا تھا۔ تو فوراً پوچھ بیٹھتے تھے کہ "بتاؤ" "نو نواں؟" اور ہم دل ہی دل میں نو کو نو سے ضرب دینا شروع کر دیتے تھے۔ اور جواب دینے بھی نہ پاتے تھے کہ ادھر سے سوال ہوتا تھا کہ "چھ ستے" اور ہم دعا کرتے تھے کہ باہر سے والد صاحب کے کسی دوست کی آواز آجائے۔ اس قسم کے موقعوں پر وہ ہمیشہ ہماری تعلیم کی طرف سے مایوس ہو جایا کرتے تھے اور والدہ صاحبہ سے کہہ دیا کرتے تھے کہ نہ معلوم صاحبزادے کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ والدہ صاحبہ اس سلسلہ میں اُن ہی کو ذمہ دار قرار دیتی تھیں اور یہ بحث کبھی کبھی نہایت خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یعنی کھانے کے برتن ہی شکستن کا مصدر گردانتے تھے۔ اور طشتریاں فرش سے ضرب کھا کر اپنا پہاڑا خود ہو جایا کرتی تھیں۔ خیر یہ تمام باتیں غنیمت تھیں اس لیے کہ ان کا کوئی تعلق ہم سے براہِ راست نہ تھا۔ مگر والد صاحب کا یہ فیصلہ کہ وہ خود آمدنامہ پڑھائیں گے۔ ذرا خوفناک تھا۔ ماسٹروں سے تو اب تک یہ کہا جاتا تھا

کہ لڑکے کا گوشت پوست آپ کا اور ہڈیاں ہماری یعنی اس طرح ماریئے گا کہ کھال اُدھڑ جائے مگر ہڈی نہ ٹوٹے لیکن یہاں تھا باپ کا معاملہ، گوشت پوست کے علاوہ ہڈیاں بھی اب پرائی نہ تھیں بہر صورت ۔ ع

موت آئی تو ٹل نہیں سکتی

آمد نامہ لے کر میدان میں چار پائی پر ان کے سامنے بیٹھنا ہی پڑا اور آمد، آمدٗ آمدی - آمدید - آمدم - آمدیم کا پہلا سبق ہم کو دیا گیا - پہلا دن، پہلا سبق اور والد صاحب سے پہلا سابقہ مگر معلوم ہوتا تھا کہ شامت اس پہلی ہی منزل پر استقبال کے لیے آئی ہوئی تھی ۔ لاکھ لاکھ کوشش کرتے ہیں کہ سبق یاد ہو جائے ورنہ والد صاحب کے کوئی دوست آجائیں مگر نہ یہ ہوتا ہے نہ وہ جھوم جھوم کر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ آنکھیں بند کر کے رٹتے ہیں ۔ مگر دماغ کسی طرح اس غیر زبان کو قبول نہیں کرتا ۔ یا اللہ یہ کس گناہ کا عذاب ہے جس کا نام ہے آمد نامہ ۔ والد صاحب نے ایک گھنٹہ کا وقت دیا تھا اس پہلے سبق کو سننے کے لیے اور یہاں آثار یہ تھے کہ ع

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

آخر موت کی گھڑی آپہنچی ۔ والد صاحب سبق سننے کے لیے بیٹھ گئے ۔ اور صاحبزادے کو رٹے کے کوسے گویا اب تک کچھ پڑھا ہی نہیں ہے ۔ آخر طوفان اُٹھا ۔ برق و رعد ۔ زلزلہ، انہدام، چیخ، کرب ۔ حقے کی چلم الٹ گئی ۔ آمد نامے کے پرزے فضا میں اڑے اور کی آمد ہی سے پچھم اٹھانے لگے ۔ اور ہم ہندوستان

کی غلامی کی زندہ تصویر بنے اپنی موت کے منتظر سرنگوں بیٹھے ہی تھے کہ یکایک والد صاحب نے پکڑ کر جو ہم کو جھنجھوڑا ہے۔ تو تہذیب کا کرتہ معہ بنیائن ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس کا لہ بیان ہمارے برہنہ جسم پہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ فارسی کی سب سے بڑی فضیلت حاصل کی ہے اور یہ کوئی خاص ایرانی چغہ ہے، جو ہم پہنے بیٹھے ہیں۔ کپڑوں کے بعد اب غالباً کھال کی باری تھی۔ کہ اس ہنگامہ کی اطلاع پا کر ماموں صاحب گھر سے نکل آئے والدہ نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ راہ گیر چلتے چلتے کھڑے ہو گئے۔ اور کتے نے دُم ہلانا چھوڑ دی۔ ماموں صاحب نے آکر ہم کو وہاں سے اٹھایا اور بمشکل تمام گھر کے اندر پہنچا دیا۔ اور والدہ صاحبہ نے سچے دل سے توبہ کی کہ اب کبھی والد صاحب کو ہماری تعلیم کی طرف متوجہ نہ کریں گی گویا یہ سبق والد صاحب نے ہم کو کم اور والدہ صاحبہ کو زیادہ دیا تھا۔

کالرہ

بھائی جان مولانا ارشد تھانوی بھوپال سے جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تھے ہم گویا ان کے ضمیمہ کے طور پر ساتھ ہی ساتھ رہتے تھے۔ اس زمانہ کے ان کے تمام دوستوں سے ہم مل چکے تھے۔ منشی پیارے لال شاکر میرٹھی۔ حضرت محوی صدیقی قاری عباس حسین ایڈیٹر رسالہ تمدن۔ مولانا ظفر الملک علوی۔ خواجہ عبد الرؤف عشرت اور مولانا صبغتہ اللہ شہید انصاری فرنگی محل وغیرہ۔ ان حضرات کے یہاں

کی تمام دعوتوں میں بھائی جان کے ساتھ ہم بھی مدعو ہوتے تھے اور بھائی جان جب ان حضرات کو اپنے یہاں بلاتے تھے اس وقت بھی ہمارا دستر خوان پہ ہونا ضروری تھا۔ اس قسم کی ایک ٹی پارٹی میں صبح بالائی اور نہ جانے کیا کیا خاک بلا ہم نے کھائی اور ایک بجے ہم پہ کالرہ کا نہایت شدید حملہ ہوا یہاں تک کہ مغرب کے وقت ہماری حالت غیر ہو گئی۔ اور ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو نبضیں بھی ڈوب چکی تھیں۔ اُس وقت ہمارے تو ہوش بجا نہ تھے مگر سنا ہے کہ باجی (خاتونِ ارشد) نے اپنے معصوم بچے سلمان الارشد کو گود میں لے کر کہا کہ اے خدا تو میرے بھائی کو تندرست کر دے۔ خواہ میرا یہ بچہ مجھ سے چھین لے۔ اللہ میاں کے یہاں تاوان لینے کا دستور تو ہے ہی نہیں مگر غالباً ان کی یہ دُعا سن لی گئی۔ اور اس آخری حالت پہ پہنچنے کے بعد ہم صحت یاب ہونا شروع ہو گئے اب پرہیز بہت سخت تھا۔ فاقوں پر فاقے آخر ایک دن ہم نے ڈاکٹر سے جب یہ سنا کہ آج کے تیسرے روز مونگ کی دال کا پانی ملے گا۔ تو اپنے ایک عزیز بچے کو چپکے سے پیسے دیئے کہ دو آنے کے لاؤ کباب اور دو آنے کے لڈو ریوڑیاں اور اس خطرناک حالت میں یہ بدپرہیزی چپکے سے کر گذرے۔ مگر کوئی نقصان نہ پہنچا۔ ایک دوسری لاجواب چوری یہ کی کہ باجی بھوپال جانے کے لیے تیار ہوئیں۔ ان کے لیے ناشتہ میں منجملہ اور چیزوں کے کھجوریں بھی تلی جا رہی تھیں۔ ہم نے آنکھ بچا کر تین کھجوریں اُڑا لیں۔ اور ان کو اطمینان سے کھانے کے لیے پاخانہ میں پہنچ گئے۔ باجی نے

کچھ تاڑ لیا۔ اور وہ بھی پیچھے پیچھے پہنچیں۔ ہم یونہی بیٹھے شوق فرما رہے تھے کہ انہوں نے آنا چاہا ہم کھنکھارے مگر جواب ہے ملا کہ ہم تو آئیں گے۔ اور فوراً سامنے آکر موجود ہوگئیں۔ آدھی کھجور منہ میں تھی آدھی ہاتھ میں دو سٹ اس میں پھینک دیں اب جو انہوں نے پوچھا کہ آپ پاجامہ اندھے قدمچوں پر کیوں تشریف فرما ہیں تو کھجور کو بمشکل تمام نگل کر جواب دیا کہ بھول گئے تھے۔ مگر چوری پکڑی جا چکی تھی اور اب ہم کھسیانے ہوکر غصہ پر تل گئے تھے۔

مولانا عبدالرحیم کلیم

مولانا کلیم والد صاحب کے دوست تھے۔ مگر خدا نے مولانا کو شاید اسی لیے پیدا کیا تھا کہ والد صاحب اُن پر اپنی تمام ذہانت صرف کرتے رہیں۔ مولانا کو دیکھتے ہی عجیب عالم ہو جاتا تھا والد صاحب کا۔ نہ جانے کس قیامت کی آمد ہوتی تھی۔ ہر مرتبہ نئی پھبتی سوجھتی تھی۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ مولانا تھے ہی بڑے پھبتی زیب۔ نہایت سیاہ رنگ چھوٹا سا قد، دوہرا جسم، چہرے پر بال تقریباً ندارد اور شکل ایسی کہ واقعی کسی انسان کی ایسی صورت اب تک ہم نے نہیں دیکھی۔ جانوروں میں البتہ بہت سے جانوروں کو اُن سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ والد صاحب ان کو زنجبار کا پرنس کہتے تھے۔ کبھی کلکتہ کے زُو کا مفرور بن مانس۔ کبھی ڈاروِن کے نظریہ کا ثبوت اور ان سے ہمیشہ حد سے گذرا ہوا

مذاق ہوا کرتا تھا۔ والد صاحب اور ان کے لطیفے آج تک لوگ دہراتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے ایک آدھ واقعہ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بیان کرنا ضروری ہے۔ اور پھر میں یہ ذکر کروں گا کہ میرے حالات میں مولانا کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔

لکھنؤ میں ایک تھیٹریکل کمپنی کے ساتھ کلکتہ والی گوہر جان آئی ہوئی تھی اور حال یہ تھا کہ بہشتی اپنی مشکیں بیچ بیچ کر اور لوگ قرض لے لے کر برابر تماشہ دیکھنے جاتے تھے۔ ہر طرف گوہر جان کے نغمے گونجتے ہوئے تھے۔ اور اسی تھیٹر کے چرچے تھے۔ والد صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اشتیاق بھائی سے جو آج کل اشتیاق احمد عباسی بیرسٹر ہیں۔ یہ کہا کہ تم کو ڈرائنگ کا بہت شوق ہے۔ تم سات آٹھ تصویریں بن مانس کی ذرا پوسٹر کے کاغذ پر بنا دو۔ چنانچہ یہ تصویریں فوراً تیار ہو گئیں۔ نہایت خوفناک بن مانس سات آٹھ کاغذوں پر تیار ہو گیا۔ اب ان پوسٹروں پر عبارت لکھی گئی کہ "آج شب کو کلکتہ کی مس گوہر کے نغمے کے بعد لکھنؤ کے مولوی عبدالرحیم صاحب حکیم اپنا شہرۂ آفاق بن مانس کا پارٹ ادا کر کے شائقین سے خراجِ تحسین حاصل کریں گے۔" ایک پوسٹر مولانا کے دروازے کے بالکل سامنے باقی ان مقامات پر جو مولانا کی گذرگاہ تھے۔ راتوں رات چسپاں کر دیئے گئے۔ اور حسبِ توقع صبح مولانا نے گھر سے نکلتے ہی جو اس پوسٹر کو دیکھا۔ تو آگ بگولا ہی تو ہو گئے۔ اپنی چھڑی سے اس پوسٹر کو

لوگوں کی نظریں بچا بچا کر نوچا۔ اور نہایت برہمی کے ساتھ اس ارادہ کے ساتھ کہ کوتوالی پہنچ کر والد صاحب سے اس زیادتی کی شکایت اور تفتیش کا مطالبہ کریں گے۔ چنانچہ روانہ ہوگئے خیال تھا کہ بس یہی ایک پوسٹر ہوگا۔ مگر بازار میں پہنچے تو وہاں لوگوں کا ایک ہجوم اس پوسٹر کو پڑھ پڑھ کر دلچسپی لے رہا تھا۔ مولانا نے گھبرا کر راستہ کاٹا۔ بجائے سڑک کے ایک گلی میں گھس گئے۔ مگر اب جو کوتوالی کے دروازے پر پہنچتے ہیں تو وہاں بھی پوسٹر اور پڑھنے والوں کا ہجوم، قہقہوں کا شور اور پھبتیوں کی لوچھاڑ، وہاں سے بھی بھاگے اور کسی نہ کسی طرح عام نظروں سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے گھر جا کر بیٹھ رہے۔ آخر کار پتہ چل گیا کہ یہ حرکت کس کی تھی خفا ہو گئے۔ بات چیت، دعا سلام، مرحبا جھپا سب ترک۔ عاشورہ کے دن حسین آباد کی ضریح کا جلوس نکلنے کے بعد والد صاحب نے دیکھا کہ مولانا برہنہ سر، برہنہ پا تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ نے مولانا کو مخاطب کیے بغیر عم محترم چودھری شفیق الزماں صاحب تعلقدار گڑھی سے فرمایا "شفیق بھائی کلیم سے لاکھ لڑائی سہی مگر اس میں بعض خصوصیات تو ایسی ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" مولانا یہ سنتے ہی تمام لڑائی جھگڑے کو بھول کر ان لوگوں کے پاس آگئے اور والد صاحب سے فرمایا "کیسی لڑائی اور کہاں کا جھگڑا مگر مجھے میری قسم صدیق دہ تو ابھی کیا کہہ رہا تھا" والد صاحب نے فرمایا "میں آپ سے تو کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔ اور نہ میں خوشامد کرنا پسند کرتا ہوں۔ البتہ جو واقعہ ہے

اِس سے انکار بھی نہیں کرسکتا۔ شفیق بھائی سے یہی کہہ رہا تھا کہ کلیم صاحب کی بعض خصوصیات سے انکار نہیں ہوسکتا۔" مولانا نے اور قریب ہوکر کہا۔" وہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ تجھے خدا کی قسم بتا تو سہی مجھے بھی"۔ والد صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔" ارے مثلاً آپ کا چہرہ ماہی مراتب کے ساتھ جلوس کے آگے گذر گیا۔ اور آپ یہاں ٹہل رہے ہیں"۔ پھر وہی گالیاں، وہی برہمی اور وہی دشمنی جس پر ہزاروں دوستیاں قربان ہوسکتی ہیں۔ ایک دعوت کے موقع پر والد صاحب کو پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ پہنچے تو دیکھا کہ ان کے ایک دوست کے نہایت گورے چٹّے بچّے کو مولانا کھلا رہے ہیں۔ بچّہ ان کے کندھے پر بیٹھا تھا لوگوں نے والد صاحب سے شکایت کی کہ آخر اتنی دیر کیوں کردی آپ نے نہایت تشویش سے فرمایا۔ سال کا شگون نکل رہا تھا۔ میں بھی ذرا وہاں ٹھہر گیا۔ مگر خدا ہی خیر کرے اب کی نوروز سؤر پر سوار ہے"۔ محفل میں قہقہہ پڑا۔ اور مولانا نے بدحواس ہوکر بچّے کو کندھے سے اُتار دیا۔ والد صاحب نے وصیّت نامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جو مولانا کی سوانح حیات کا درجہ رکھتی ہے احباب میں بے حد مقبول تھی اور اس کو سننے کے لیے محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد اِس وصیّت نامہ کی اشاعت پر زور دیا گیا۔ مگر میں نے اس کتاب کی اشاعت کو کسی طرح مناسب نہ سمجھا۔ جس کو خود والد صاحب نے باوجود اس قدر مقبولیت کے طبع کرانا

کبھی پسند نہ کیا۔ مولانا کلیم کی پہنچ اسی مذاق کے سلسلہ میں والد صاحب کے ساتھ ساتھ مہاراجہ صاحب محمود آباد، مہاراجہ صاحب رامپور اور اسی طرح کی تمام اونچی سوسائٹی میں تھی۔ اور ہر جگہ مولانا سے یکساں طور پر دلچسپی لی جاتی تھی مولانا کے انتقال کے بعد یہ احساس تو خود مجھے بھی ہوا تھا کہ والد صاحب کچھ بجھ کر رہ گئے تھے گویا مشقِ سخن کے لیے مصرعِ طرح باقی نہ رہا تھا۔ اور طبع آزمائی اب غیر طرحی سی ہو کر رہ گئی تھی یا پرانے کلام سے داد حاصل کرنے کا طریقہ باقی رہ گیا تھا۔ خیر یہ داستان تو بہت طویل ہے۔ مولانا کے لطائف کہاں تک بیان ہو سکتے ہیں۔ دفتر کے دفتر سیاہ کر دیجئے تو بھی ان کی سیاہی کا پورا مفہوم پیش کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ حکایت جس قدر بیان کی جائے اسی قدر لذیذ اور طویل ہوتی چلی جائے گی۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں مولانا کو کس قدر شامل پاتا ہوں اس کو بیان کر دوں۔

آمد نامہ کے سلسلہ میں جو عذاب مجھ پر نازل ہوا تھا۔ اُس کے بعد بھی والد صاحب کو اطمینان نہ ہوا۔ اور آپ نے عذاب کے ایک مستقل فرشتے یعنی مولانا عبدالرحیم کلیم کے سپرد کرنے کا ہمارے متعلق فیصلہ کر دیا۔ مولانا فارسی کے بہت بڑے فاضل تھے۔ فارسی میں شعر بھی خوب کہتے تھے۔ اور رؤسا کے یہاں فارسی پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ یہ تو سب کچھ درست مگر اُس استاد سے تعلیم حاصل کرنا جس کی صورت دیکھ کر خواب تو خواب عالم بیداری میں انسان

اُچھل پڑے۔ عذاب نہیں تو اور کیا تھا۔ مگر چونکہ ہمارے فارسی اعمال اسی کے مستحق تھے لہٰذا طے یہ ہوا کہ ہم روزانہ مولانا کے درِ دولت پر حاضر ہوا کریں۔ اور ان سے فارسی پڑھا کریں۔ اور مصیبت بالائے مصیبت ملاحظہ ہو کہ باہر تو صرف مولانا کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ گھر پہنچے تو دیکھا کہ آپ ایک برائے نام عرقی باندھے "لال لنگوٹے والے کی جے" بول رہے ہیں۔ اور خود ہی اس جے کے مخاطب بھی نظر آتے ہیں۔ ایک دم ڈِنر سوٹ والا رنگ اس پر وہ رُخِ روشن اور ادھر اُدھر ہلتی ہوئی گردن بلکہ معاف کیجئے گا یہ تو غلط بیانی ہوئی۔ گردن تو تھی نہیں۔ کندھوں سے چہرہ براہِ راست ملا دیا گیا تھا۔ مولانا کو اس عالم میں دیکھ کر سند باد جہازی والا تسمہ پا یاد آ گیا۔ اور کبھی خیال یہ ہوا کہ الہ دین کا چراغ تو گل ہو گیا ہے۔ اس کا یہ ڈیوٹ غا ہوگل اب تک موجود ہے نہ معلوم ہم کو کس برت مارے گا یہ مولوی۔ دل سے دعا نکلی کہ اے رب العالمین یہ صاحب خواہ انسان ہوں یا نہ ہوں۔ ہمارا آمدنامہ چھین کر درخت پر چڑھ جائیں تو میں پانچ پیسے کی شیرینی پر الحمی نیاز دلواؤں۔ مگر اس قسم کی دعائیں ذرا مشکل سے قبول ہوتی ہیں البتہ اتنی ضرور قبول ہوئی کہ مولانا نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھانا شروع کر دیا کسی قسم کی سختی نہیں فرمائی۔ اور جو دہشت ان کی صورت دیکھ کر قائم ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو گئی مولانا کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دلنشین تھا۔ اور وہ کچھ اس انداز سے سمجھاتے تھے کہ دو سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں مگر ان کی بات سمجھ میں

آجاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی ہمارے لیے چند ہی دنوں میں آسان ہو گئی۔

خالو بدن اور اُن کا لال اسکول

محض فارسی کے بل بوتے پہ زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی یہ کوئی مغلوں کا دربار تو ہے نہیں کہ انسان اپنے گھر بیٹھے علوم میں فاضل ہو کر ابوالفضل بن جائے۔ والدہ صاحبہ کو سب سے زیادہ فکر تو یہ تھی صاحبزادے کی عمر بڑھ رہی ہے۔ اور باقاعدہ تعلیم کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر ان کے کام اُن کی ایک بہن آئیں۔ جن کے شوہر ایک مڈل اسکول میں ملازم تھے۔ ہمارے ان خالو کا اسم گرامی تھا سیّد محمد رضا اور کہلاتے تھے بدن۔ والدہ صاحبہ ان کو صرف بدن کہتی تھیں۔ اور ہم خالو بدن۔ والدہ صاحبہ نے ان بزرگ کو ہمارا اتالیقِ تعلیم مقرر کر دیا۔ اور ہمارے ان خالو بدن نے ایک آدھ حساب کا سوال ہم سے حل کرایا۔ کچھ اردو پڑھوائی کچھ انگریزی کا جائزہ لیا اور نہایت ناک بھوں چڑھا کر کہہ دیا "نِل" یعنی کچھ بھی نہیں۔ مگر ان کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا انہوں نے مشورہ دیا۔ کہ ہمارا داخلہ ان کے اسکول میں کر دیا جائے۔ اُن کے اسکول کا نام لال اسکول تھا۔ اس لیے کہ وہ سُرخ رنگ سے رنگا ہوا تھا اور وہ اصل چرچ مشن ہائی اسکول کی برانچ تھا۔ خالو بدن اس اسکول میں ماسٹر بھی نہیں بلکہ مولوی تھے۔ بہرحال اُن کا اثر اتنا ضرور تھا کہ ہم باوجود نالائق محض ہونے کے چوتھے درجہ میں لے لیے گئے۔ اور پہلے ہی سال نہ صرف یہ کیونکہ چوتھا درجہ

پاس کر کے پانچویں میں آ گئے۔ اب ایک نیا مرض شروع ہو گیا یعنی میں درد کے دورے پڑنے لگے۔ الاماں والحفیظ اس قدر شدید درد کہ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے محفوظ تو خیر ہم بھی تھے مگر درد بھی آخر ظالم ایک تو یہ کہ ٹھیک پونے دس بجے دن کو شروع ہوتا تھا ½ ۹ بجے اس لیے نہیں کہ ممکن تھا کہ لوگ کھانے کو منع کر دیتے اور دس بجے اس لیے نہیں کہ پھر بعد از وقت ہوتا وہ تو اس کا وقت مقرر تھا ½ ۹ کھانا کھا کر کتابیں سنبھالیں کپڑے پہن کر کھڑے ہوئے اور درد کا دورہ شروع ہو گیا۔ اب کوئی کتابیں سنبھال رہا ہے کوئی شیروانی اتار رہا ہے کسی نے ٹوپی تھامی تو کسی نے جوتا اتارا اور ہم کو کسی نہ کسی طرح بستر پر پہنچا دیا گیا

دس بجے۔ ساڑھے دس بجے اور آخر کم ہوتے ہوتے گیارہ بجے تک درد ختم اور اسکول غائب اب ہم چاہے کھیلیں چاہے چین کی بنسی بجائیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ پھر لطف یہ کہ عجیب سمجھدار علالت تھی۔ اتوار کو کبھی اس درد کا دورہ نہ پڑا۔ یہاں تک کہ باقی چھٹیوں میں بھی درد کی کوئی شکایت کبھی نہیں ہوئی قصہ دراصل یہ تھا کہ لال اسکول میں ایک تھے ماسٹر پنڈت بھولا ناتھ جی وہ حساب پڑھانے تھے۔ ان حضرت کو نہ جانے یہ کیا مرض تھا کہ جتنا پڑھاتے اس سے کہیں زیادہ سوال گھر پر کرنے کے لیے دے دیتے تھے۔ اور سوال نہ کیے جائیں تو ایخ والی پٹری آڑی کر کے وہ ہاتھ رسید کرتے تھے کہ آدمی چکر دہ ہی ہو جاتے ان کے اسی تشدد نے ہم کو اس مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس مرض کا نتیجہ ظاہر ہے

کر دوا علاج میں سینکڑوں روپیہ پھونکا گیا۔ والدہ صاحبہ کو مستقل طور پر ہماری صحت کی فکر رہنے لگی۔ اور سہ ماہی امتحان کا نتیجہ جو نکلا تو ہم سوائے اردو اور فارسی کے ہر مضمون میں اولوالعزمی سے فیل ہوئے تھے۔ ششماہی میں بھی فیل ہوئے۔ اور سالانہ امتحان میں تو کمال ہی ہو گیا جس روز نتیجہ سنایا جانے والا تھا مسٹر بنجمن پال نے لڑکوں کو ہدایت کر دی کہ ذرا صاف کپڑے پہن کر آئیں۔ اسکول کے منیجر آئیں گے اور وہی نتیجہ سنائیں گے چنانچہ سب سے زیادہ شاندار لباس ہمارا تھا۔ ہر ایک ہمارے ٹھاٹھ دیکھ کر ایک مرتبہ غور سے ضرور دیکھتا تھا مسٹر بنجمن پال نے بھی ہمارے یہ ٹھاٹھ دیکھے تو ہنس کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے اپنی جماعت میں سب سے اول تم ہی آنے والے ہو مگر نتیجہ جو سنایا گیا تو ہم فیل تھے۔ اسی شاندار لباس کے ساتھ اپنی شاندار ناکامی کا مژدہ ہم نے نہیں ہمارے آنسوؤں نے گھر آ کر سنایا۔ خوب خوب بار دیئے۔ دوسرے سال خدا خدا کر کے پاس ہوئے اور تیسرے سال چھٹا درجہ پاس کر کے لال اسکول کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ اس اسکول میں چھٹے درجے ہی تک تعلیم ہوتی تھی۔

گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد

اب ہمارا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں ہوا۔ حالانکہ ہم بہت کمزور تھے۔ اور لال اسکول کے طالب علموں کے متعلق ان باقاعدہ اسکولوں کی رائے

بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اس لیے داخلہ میں بڑی دقت ہوئی۔ مگر دوڑ دھوپ سعی سفارش سے ساتویں درجہ میں لے لیے گئے۔ اب گویا ہم اچھے خاصے بڑے آدمی تھے، ایک بڑے اسکول کے بڑے طالب علم۔ بڑی کتابیں۔ بڑے بڑے تعلیم یافتہ استاد بہت بڑا کھیل کا میدان۔ بخرض ہر چیز بڑی تھی۔ اور اسی کے ساتھ شرارتیں بھی بڑی۔ کچھ دن تک تو اسکول میں بھیگی بلی بن کر رہے۔ اس لیے کہ ایک مڈل اسکول سے آئے تھے اور یہاں کے لڑکے مڈل اسکول کے لڑکوں کو گاؤدی سمجھا کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ہمارے دوستوں کی بھی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ اور پھر آخر تک اسی جماعت نے حسین آباد ہائی اسکول میں زندگی کی روح پھونکی۔ پڑھنا وڑھنا تو خیر یہاں بھی برائے نام تھا۔ البتہ تمام مشاغل میں ہم پیش پیش تھے۔ مثلاً سب سے پہلے اسکاؤٹ ہم ہوئے۔ کھیل کود کی تمام درخواستیں لے کر ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچتے تھے۔ اسکول کے تمام غیر تعلیمی ہنگاموں میں سب سے زیادہ ہمارا حصہ تھا۔ مگر تعلیم!۔

یعنی دراصل شرارتیں اپنے شباب پر تھیں۔ اسکول کے ہر استاد کو معلوم تھا کہ تمام شرارتیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ شرارتوں میں کوئی کمینہ پن، کوئی چھوٹی بات اور کوئی ایسی بات کبھی نہ ہوتی تھی کہ جس سے اسکول کی عظمت یا گھرانے کی عزت پر حرف آسکے۔ اس کے علاوہ ان شرارتوں میں ذہانت کو بھی کافی دخل ہوتا تھا۔ اور ہم تمام دوستوں میں اتفاق اس قدر تھا

کرکے مچاں کوئی استاد ہم میں سے کسی کا بھید پائے۔ حسین آباد ہائی اسکول ایک
بلند ٹیلے پر واقع ہے اور اس کے متوازی دوسرے ٹیلے پر شاہ پیر محمد صاحب
کا مزار اور مسجد اورنگ زیب ہے۔ ان دونوں ٹیلوں کی درمیانی نشیب میں
ایک سڑک ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ لان برابر کرنے پتھر کا وزنی رولر دھکیل کر
اس ڈھال تک لے گئے جس کے نیچے سڑک تھی اور انجام پر غور کیے بغیر محض
یہ تماشہ دیکھنے لگے کہ یہ رولر کس طرح ڈھال پر لڑھکتا ہے۔ اب جو اسے
لڑھکا دیتے ہیں تو اس نے توپ کے گولے کی طرح پہلے تو جاکر نیچے کا جنگلہ
توڑا اس کے بعد سڑک پر جاکر ایک لاری سے متصادم ہو گیا۔ اور لاری کا ایک
حصہ چکنا چور کر دیا۔ اس انجام کا وہم و گمان بھی نہ تھا سمجھتے کہ نہ جانے کیا گت
بنے گی۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب اس کشمکش و پیچ میں تھے کہ اس شرارت کے
کسی ایک یا دو ذمہ داروں کا پتہ چل جائے۔ تو وہ سزا بھی دیں۔ لاکھ لاکھ تحقیقات
کی۔ مگر تمام جماعت نے صرف یہی کہا کہ قصور سب کا ہے اور ہم سب ہی تھے
جو نتیجہ اس شرارت کا برآمد ہوا ہے اس کی ہم کو خبر نہ تھی اور اب ہر سزا کے
ہم مستحق ہیں۔ آخر مجبور ہو کر تمام جماعت کو مورد الزام قرار دے کر خفیف سی
بید بازی ہوگئی ہم لوگوں نے بعد میں جشن اتحاد منایا جس میں دھواں دھار تقریریں
ہوئیں اور ایک دوسرے کو اس اتحاد اور اتفاق پر مبارکباد دے کر ہم لوگوں نے
اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی تمام قومی جماعتوں کو چاہیئے کہ وہ ہم سے اتحاد کا

سبق نہیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر مولوی زین العباد صاحب ذرا خاموش قسم کے سنجیدہ بزرگ تھے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شرارتوں کو پسند نہیں کر سکتے۔ مگر اندازہ بعد میں یہ ہوا کہ وہ شرارت کو طالب علم کا جائز حق بھی سمجھتے تھے۔ بشرطیکہ اس شرارت سے اسکول کے ڈسپلن میں کوئی خاص خلل واقع نہ ہو۔ مثلاً خود بہ خاکسار اپنے تمام استادوں کی نقل اتارا کرتا تھا۔ ان کے لب و لہجہ سے لے کر ان کی کمزوریوں تک کی نقل۔ بزعیہ شعوری طور پر سب ہی میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہیں اور جن کا احساس اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی بتائے۔ مثلاً کسی کی عادت ہوتی ہے کہ لکھتے وقت مُنہ چڑھاتا جاتا ہے کسی کو یہ مرض ہوتا ہے کہ زبان نکال کر خوشنویسی کرے اسی طرح مختلف قسم کی عادتیں مختلف لوگوں میں نظر آتی ہیں۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کی عادت تھی کہ وہ پڑھاتے وقت دانت سے کچھ ریشے برابر کاٹتے رہتے تھے ہمارے ہسٹری کے استاد ماسٹر ٹکرجی کی عادت تھی کہ وہ ایک ادائے خاص کے ساتھ شانے اُچکاتے تھے اور سوال کرتے وقت لب زیریں کو اس طرح باہر نکال دیتے تھے گویا طالب علم کو مُنہ چڑھا رہے ہیں۔ ہمارے ایک اور اُستاد علامہ جیلانی صاحب تھے۔ وہ تو گویا ہم لوگوں کے نہایت بے تکلف دوست تھے۔ ان کی کمزوریاں ہم خود ان سے کہہ دیتے تھے مگر وہ کمزوریاں اس قدر زیادہ تھیں کہ وہ بچارے ان کی اصلاح سے اس عمر میں قاصر تھے۔ ہمارے فارسی کے اُستاد مولوی فضل حسن صاحب کے متعلق ہم لوگوں کی رائے یہ تھی کہ وہ بچارے

کی موت کسی دن کلاس ہی میں واقع ہوگی۔ بس یہ ہے کہ ان کے پڑھانے کے طریقے اور ورزش میں بہت کم فرق تھا۔ جسم کی حالت یہ تھی کہ بالکل چڑیا نظر آتے تھے۔ ناک کی پھننگ پر رکھی ہوئی عینک، بغل میں کتابوں کا ڈھیر اور برآمدہ میں ٹہل رہے ہیں۔ اس انتظار میں کہ گھنٹہ بجے اور درجہ میں تشریف لے آئیں۔ پھر کیا مجال کہ ایک منٹ بھی ضائع ہو۔ آتے ہی نعرہ بلند کیا۔ سائنس کے لڑکو سائنس میں جاؤ۔ فارسی والو آگے بڑھو۔ صفحہ اکتیس نثر خوانندہ مغربی در صف بزازان حلب می گفت کہ اے خداوندانِ نعمت اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت قناعت کیا سمجھے۔ مارا قناعت۔ رسم سوال از جہان برخاستے پھر سے سنیئے اور یہ سب کچھ ایک سانس میں۔ گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ چہرہ کے آثار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ اس وقت بیچارے کا کم سے کم ایک پھیپھڑا حلق میں ضرور ہے۔ بڑھے آدمی، کمزوری کا حال یہ کہ الفاظ کے ساتھ تمام جسم کو زبان بنا کر بولتے تھے۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں بس اس کے بعد ان کو کچھ نہیں کہنا ہے۔ مگر وہ مدتوں اسی شان سے پڑھاتے رہے۔ نتیجہ یہ کہ آخر ہم لوگ جو پہلے ان کی زندگی سے مایوس تھے اب موت سے مایوس ہو گئے۔ اور طے ہو گیا کہ یہ مریں گے نہیں، بلکہ سوکھ جائیں گے۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ حسین آباد ہائی اسکول میں اتنا محنتی اور حلال کی روٹی کھانے والا دوسرا کوئی استاد نہ تھا۔ جب ان کو یہ اطلاع ہوئی کہ ہم ان کی نقل بھی اتارتے ہیں۔ تو نقل سننے

کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ اور جب نقل سنی تو فرمایا کہ نقل مطابق اصل ضرور ہے مگر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ع

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

باقی استادوں میں سے کچھ ہنس کر چپ ہو رہے کچھ برا مان گئے اور جہاں تک ہم کو یاد پڑتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب نے بافضالہ صاحب سید امیر احمد صاحب نے جو آج کل ہیڈ ماسٹر ہیں اور اس وقت اسسٹنٹ ماسٹر تھے۔ یہ فرمایا تھا کہ نقل اتارنا بڑی ذہانت کا کام ہے۔

سوشل سیکرٹری

اسی زمانہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول حسین آباد میں .... کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بڑی محنت سے اس کلب کے لیے قواعد و ضوابط وغیرہ مرتب کر کے عہدیداروں کا انتخاب کیا۔ انتخاب بھی اس کو نہ کہنا چاہیے بلکہ عہدیدار خود مقرر کیے ہم کو اس کا سوشل سیکرٹری بنایا گیا۔ اور ہمارے ہی زیر اہتمام ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا۔ جو جلسہ تقسیم انعامات کی قسم کی ایک چیز تھا۔ یہ جلسہ ہم نے ایک سب کمیٹی کی مدد سے اپنے انتظامات کے ماتحت بیحد کامیاب بنا دیا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمارے انتظامات کی بے حد تعریف کی۔ سوائے اس ایک بدانتظامی کے کہ مٹھائی کم پڑ گئی تھی۔ مگر

وہ کم پڑنا ہی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ ہم صبح سے اپنی کمیٹی کے ممبروں کے برابر مٹھائی کا ذائقہ چکھنے میں مصروف تھے کہ کہیں کوئی چیز بد مزہ نہ ہو جائے۔ بلکہ دس پندرہ منٹ تو ہم سب نے مل کر محض یہ اندازہ کرنے کے لیے لگائے تھے کہ ایک آدمی کو جب یہ تحفہ ملے گا تو اس کو کھا کر اس کے پیٹ کا کتنا حصہ بھر سکے گا۔

بدرالحسن

حسین آباد ہائی اسکول میں ہمارے ایک ہم جماعت بدرالحسن تھے۔ ان حضرت کو ہم سب نے اتفاقِ رائے سے اپنا سالارِ اعظم مان لیا تھا۔ عجیب ذات شریف تھے یہ بزرگ بھی۔ ہم لوگ ان کو بدو بدو کہا کرتے تھے اور وہ اتفی بدوؤں کی سی شکل بھی رکھتے تھے معلوم یہ ہوتا تھا کہ ابھی عرب کے صحرا سے اونٹ چھوڑ کر یا کسی قافلہ کو لوٹ کر آیا ہے۔ یہ حضرت بھی اسکول میں پڑھنے نہیں آتے تھے۔ بلکہ اسکول کی غیر تعلیمی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ جو سوجھتی انھیں کی سوجھتی تھی۔ اسکول میں اعلان ہوا کہ کل جلسہ تقسیم انعامات کے لیے وزیر تعلیم صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ طالب علموں کو چاہیے کہ ذرا صاف کپڑے پہن کر آئیں اور تمیز سے رہیں۔ بدو نے اسی وقت جا کر دوسرے دن کے لیے اہتمام شروع کر دیئے اور دوسرے دن جو ہم لوگوں نے ان کو دیکھا ہے تو کسی کی ہنسی ضبط نہ ہوئی تھی۔ سر استرے سے منڈوایا تھا اس پر تیل نہایت اہتمام

سے چھیڑا تھا۔ اور پہنے ہوئے تھے سوٹ جس وقت ایک انعام کے لیے آپ
کو آواز دی گئی ہے آپ نہایت متانت کے ساتھ اسی سج دھج سے ڈپٹی تعلیم
صاحب کے سامنے گئے انعام لیا اور تالیوں کی گونج میں واپس آ گئے۔ مگر
اس وقت استادوں تک کا یہ حال تھا کہ ہنسی روکنے کے لیے منہ پر رومال
رکھے ہوئے تھے اور ہیڈ ماسٹر کے نتھنوں کے پھیلاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ
وہ بھی زبردستی سنجیدگی کی اداکاری فرما رہے ہیں اس قسم کی ایک دو نہیں ہزاروں
حرکتیں وہ حضرت روز فرمایا کرتے تھے جماعت میں استادوں سے ایک سے
ایک لاجواب قسم کا سوال کر بیٹھتے تھے اور استادوں کو جان چھوڑانا مشکل ہو
جاتی تھی۔ ایک دن میری بیماری کی اطلاع پا کر عیادت کے لیے تشریف لائے
دیر تک بیٹھے رہے جب جانے لگے تو اچھے خاصے تھے صبح اطلاع
ملی کہ بدو کا انتقال ہو گیا کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ دل نے کہا کہ اس میں بھی کوئی
شرارت ہے۔ مگر ایسی خبر پا کر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ ہم بستر علالت پر دراز رہتے
اسی حالت میں ان کے گھر گئے۔ معلوم ہوا کہ شرارت نہیں واقعی یہ حادثہ
ہوا ہے۔ رات کو بخار آیا اور صبح ہوتے ہوتے ختم۔ اب ایک سوال یہ تھا
کہ اس دن شہر میں ہڑتال تھی کہیں کفن دستیاب نہ ہوتا تھا۔ مرحوم کے نانا صاحب
نے فرمایا کہ میرے پاس کعبہ شریف کا کفن رکھا ہوا ہے۔ مگر میں اسے اس
لیے نہیں دے سکتا۔ کہ پھر مجھے نہ جانے میسر ہو یا نہ ہو۔ ان کی عقیدت

کا درجہ خواہ کیسا ہی بلند ہو۔ مگر اس موقع پہ کفن دے دینا بھی اتنے ہی ثواب کا کام تھا جسے وہ کسی استدلال کے باوجود نہ سمجھ سکے آخر ہم میں سے ایک صاحب نے ایک بزار کی دکان کھلوا کر کفن حاصل کیا۔ اور اپنے اسکول اور اپنی جماعت کی زندگی دفن کر آئے۔ بدو کی موت کا میری صحت پر بہت برا اثر پڑا اور معمولی سی بیماری اس حادثہ کے ماتحت طول کھینچ گئی۔

عشق

اسی زمانہ میں یہ یاد نہیں کہ اس علالت سے پہلے یا اس کے بعد بہر صورت اسی دور میں کیوپڈ کو بھی اپنا تختۂ مشق بنانے کے لیے ہمارا ہی انتخاب کرنا پڑا۔ یوں تو بہت دنوں سے اپنی ایک قریبی عزیزہ کے متعلق دل میں کچھ عجیب جذبات نشو و نما پا رہے تھے۔ مگر اب اس کا اعلان بھی ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے اپنے بھائی جان ارشد تھانوی صاحب سے جو اب ہمارے بہنوئی بھی بن چکے تھے اپنے اس انتخاب کا ذکر کر دیا۔ دراصل یہ عزیزہ اُن ہی کی ہمشیرہ عزیزہ تھیں۔ ارشد صاحب نے اس سلسلہ میں کوئی گہری دلچسپی نہ لی اس لیے کہ وہ اس انتخاب کی سنجیدگی کے غالباً قائل نہ تھے۔ اور اس کو بھی ہمارا طفلانہ اور وقتی جذبہ سمجھ رہے تھے۔ مگر یہاں حالات روز بروز شدید ہو رہے تھے۔ اس لڑکی بیچاری کا حال تو ہم کو معلوم نہیں۔ مگر ہمیں یہ یقین ہو چکا

تھا کہ ہو نہ ہو یہ جذبہ جو ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے اسی کو عشق کہتے ہیں۔ اور اگر اس کے نتائج حسب و لخواہ نہ ہوتے تو معلوم نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا۔ بات اصل میں یہ تھی کہ ہمارے اکثر ساتھیوں کو عشق ہو چکا تھا وہ اپنے قصے برابر سناتے تھے۔ کوئی اپنی محبوبہ کا خط دکھاتا تھا کہ وہ کس طرح ان حضرت کیلئے تڑپ رہی ہے کوئی اپنا خط سناتا تھا۔ کہ میں اپنی منگیتر یا محبوبہ کو کیا لکھ رہا ہوں کوئی صاحب ایک خشک پھول لیے پھرتے تھے کہ یہ پھول میری محبوبہ نے میرے کوٹ میں اپنے ہاتھ سے محبت کی یادگار کے طور پر لگایا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی تو اس حد تک عاشق تھے کہ وہ ایک نہایت مکروہ صورت کی مدقوق سی بلی پالے ہوئے تھے۔ اور جب ان سے اس ذوق سلیم کی تفصیل دریافت کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ بلی ان کی محبوبہ دلنواز نے پالی تھی۔ بلکہ جب وہ پردہ س و الامکان چھوڑ کر چلی گئیں۔ تو بلی میرے سپرد کر گئیں کہ اس بلی سے سنگ بیٹھے کا لطف حاصل کرنا۔ ان حالات میں ہمارے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہم بے عشق کے رہ جاتے بنت عم سے طبیعت کو جو مناسبت اور دل کو جو لگاؤ تھا وہ تو خیر اپنی جگہ پر ایک نہایت شریفانہ جذبہ تھا۔ مگر ہم نے عشق کی جو صورت اختیار کی تھی وہ یقیناً فیشن کے ماتحت تھی چنانچہ ہمارے اس عشق کی اطلاع بھی ہمارے دوستوں کو تھی اور وہ ہمارے عشق سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے کہ ہم لوگ آپس میں مل کر آہ و زاریاں کیا کرتے تھے،

وہ ہائے گل پکارتے تھے۔ اور ہم ہائے دل۔ ہماری ہنت گم بیچاری کا انتقال ہو چکا ہے خدا بھی ہم کو معاف کرے اور ان کی روح بھی نہ شرمائے۔ اس لیے کہ اس میں ان کا تو کوئی قصور تھا ہی نہیں۔ مگر حرکتیں تو سب ہماری تھیں۔ اپنے دوستوں کے سامنے عشق کی دوڑ میں ہم بھی کسی سے پیچھے رہنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے بھی خط بگاڑ بگاڑ کر۔ ع

ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

اور ان خطوں کو اپنے ان ہمراز دوستوں کو دکھاتے تھے جن کے مکتوب محبت ہم دیکھ چکے تھے۔ اور دکھایا کرتے تھے۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ ہم بھی اس سلسلہ میں سرخرو ہو سکیں اور ہمارے متعلق بھی ہمارے دوست سمجھ سکیں کہ ہم بھی وہ ہیں جن پر خوبصورت لڑکیاں فریفتہ ہو سکتی ہیں حالانکہ ہم پر صرف وہی خوبصورت لڑکی فریفتہ ہو سکتی تھی جس کی بصارت ہی کوئی خطرناک قسم کا نقص ہوتا۔ اور وہ بیچاری لڑکی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ اس کی فریفتگی کے دستاویزی ثبوت اس کے ہونہار چچازاد بھائی اور اس سے شادی کے امیدوار صاحب مرتب فرما رہے ہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ یہ اطلاع تھی کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری شادی اس کے ساتھ ہو جائے۔ ادھر تو ہم یہ جعلی خطوط بنایا کرتے تھے اور ادھر اپنی بڑی بہن خاتون ارشد صاحبہ اور بھائی جان ارشد تھانوی سے بضد تھے کہ ہمیں

شادی کرا ہی دیجئے۔ یہاں تک کہ یہ اطلاع والد صاحب کو بھی ہو گئی۔ اور انہوں نے قطعی انکار کر دیا کہ یہ نسبت ہرگز نہیں ہو سکتی مگر جن کو عشق صادق ہوتا ہے وہ بھلا ان دھمکیوں میں آتے ہیں۔ ہم تو طے کیے بیٹھے تھے کہ شادی ہو گی اور وہیں ہو گی ورنہ کبھی نہ ہو گی اور کہیں نہ ہو گی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ والد صاحب نے سمجھایا اور ہم نے جی کڑا کر کے صاف کہہ دیا کہ اگر وہاں شادی نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ اب تو ہمت بڑھ ہی چکی تھی اور عاشق کو ڈر بھی کس بات کا ہو سکتا تھا مصائب کے لیے اگر تیار نہ ہوتے اختلافات سے اگر مرعوب ہی ہو جاتے تو عشق ہی کیوں کرتے۔ آخر والد صاحب کو بھی ایک خط لکھ دیا کہ اگر میری شادی وہاں نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ والد صاحب نے اپنے ریوالور میں چھ کارتوس بھرے اور ملازم کو دیا کہ جا کر چھوٹے میاں کو دے آؤ۔ اور کہنا کہ بسم اللہ۔ اس جواب کی امید بھی نہ تھی۔ ریوالور دیکھ کر دم ہی تو نکل گیا ادھر والدہ صاحبہ نے سر پیٹ لیا کہ کیا غضب کیا تم نے وہ اپنی جان دے دیگا مگر پولیس کے محکمے ہوئے ان تجربہ کار بزرگ نے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ تم چپکی بیٹھی رہو جو زبان سے خودکشی کہہ دے وہ خودکشی کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ اور اگر خودکشی کرے تو سمجھ لینا کہ ٹھکانے لگا۔ اس قسم کے لوگ یا تو بعد میں بدمعاش ہو جاتے ہیں ورنہ قتل کے جرم میں پھانسی پایا کرتے ہیں ادھر ہم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریوالور اٹھایا۔ ایک مرتبہ دل مضبوط

رکھ دیا۔ ریوالور کی نال کنپٹی پر رکھ کر کلمہ پڑھا لبلبی کو ٹٹولا اور پھر کمپوڈر صاحب سے کہا کہ آپ ذرا اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کر لیتے تو اچھا تھا۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئے ریوالور کنپٹی سے ہٹ کر میز پر آ گیا۔ اور ہم کو محسوس ہو گیا کہ عشق اسی وقت تک دلچسپ مشغلہ ہے جب تک جان جوکھوں کا سوال پیدا نہ ہو۔ ریوالور والد صاحب کے ہاتھوں میں اور ہم ان کے قدموں میں نظر آئے۔ رہ گیا دل وہ اب تک لکھنؤ اور بھوپال کے درمیان گو مگو کے عالم میں تھا مگر رفتہ رفتہ جھانسی تک آیا پھر دہلی پھر کانپور۔ پھر اناؤ اور آخر لکھنؤ۔ ان عزیزہ کی شادی کچھ دن بعد ان سے ایک ننھیالی عزیز کے ساتھ ہو گئی۔ جو ہم سے کہیں بہتر تھے۔ مگر شادی کے کچھ ہی دن بعد وہ بیچاری نمونیہ میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جہاں محبت بھی جنگلی جانور کی طرح ریوالور سے بھاگ جاتی ہے۔ مرنے کی دھمکی کس نے دی اور مرا کون؟ واقعی عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد ہوتا ہے اور مردانگی پر روشنی ڈالنے کی غالباً ہمیں اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ماسٹر بخشش احمد

اس عشق سے فارغ ہو کر پھر تعلیم کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ اس لیے کہ عاشق تو گویا ضمنی طور پر ہو گئے تھے۔ ورنہ تھے تو طالب علم ہی۔ والد صاحب

اس واقعہ کے بعد ذرا چوکنا ہو گئے تھے۔ اور ان کو اب یہ پتہ چل چکا تھا کہ صاحبزادے
میں بغاوت کے پورے آثار موجود ہیں۔ اگر ذرا بھی ان کی طرف سے غفلت
برتی گئی۔ تو یہ حضرت نہ جانے کیا گل کھلا بیٹھیں گے۔ لہٰذا ان کو ایک ایسے
آدمی کی تلاش تھی جو گھر ہی پر رہ کر ہماری تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری اپنے
سر لے لے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بی اے بی ٹی قسم کے بزرگ تشریف لائے
ٹھگنا سا قد، منہ پر مگس نما مونچھیں، ہمارا ایک جوتا ان کے دونوں پیروں میں آسکتا
تھا۔ اور ہماری شیروانی پہننے کے بعد ان کو پاجامے کی ضرورت بھی نہ رہتی۔ ہم سمجھے
رہے تھے کہ والد صاحب یہ جاندار کھلونا ہم سے خوش ہو کر ہمارے کھیلنے کے
لیے لائے ہیں۔ مگر پتہ چلا کہ یہ حضرت ہمارے اتالیق مقرر ہوئے ہیں جو پورب کے
رہنے والے ہیں۔ اسم مبارک بخشش احمد ہے۔ غریب خانہ ہی پر قیام فرمائیں گے
اور چوبیس گھنٹے ہم پر نازل رہیں گے۔ چنانچہ ان بزرگ نے ہم کو اپنی نگرانی میں
لے لیا اور ہماری تعلیم اور تربیت شروع کر دی۔ آدمی مختصر سے ضرور تھے۔ مگر اس
چھوٹے سے قد میں بلا کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ بڑے داؤں پیچ اور کاٹ چھانٹ
کے بزرگ تھے۔ یعنی بانوٹی۔ شروع شروع میں آپ نے اپنی ذات
سے دلچسپی پیدا کرانے کے سامان کئے۔ ٹینس کھیلنے کا انتظام کیا۔ ریکٹ آئے
جال آیا۔ گیندیں آئیں۔ لان درست ہوا اور ہم نے باقاعدہ ٹینس شروع کر دی۔
ماسٹر صاحب سے دوستی سی ہو گئی تھی۔ اور ہم ان کو پسند کرنے لگے تھے۔ یہاں تک

پڑھانے کا سوال ہے۔ اس پر وہ بہت زیادہ زور نہ دیتے تھے اور پڑھاتے
تھے تو وہ بھی نہایت دلکشی سے پڑھا کر سکھاتے تاکہ سبق کوئی قابلِ نفرت چیز نہ بنے
بلکہ قابلِ قبول ہو سکے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ طریقہ بھی بہت اچھا تھا کہ ہماری ہر
معمولی سے معمولی صلاحیت کی بے حد تعریف کرتے تھے اور کمزوریوں کو جہاں تک
ہوتا تھا دبانے کی کوشش کرتے تھے ان کا ہر ایک سے یہ کہنا کہ یہ لڑکا بلا کا
ذہین ہے۔ اس کی ذہانت سے آج تک کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ یہ کوئی چیز ہوتا
ہم کو زبردستی ذہین اور تعلیم کا شوقین بنا رہا تھا۔ خوشامد پسندی تو خیر فطرت میں تھی ہی
اُسی کو بھی اُبھری ہوئی رگ پر ماسٹر بخشش احمد کی نباضی نے ہاتھ رکھ دیا۔ اور اب وہ
بے پرواہ طالب علم جو اب تک تعلیم کو والدین کا استبداد سمجھا کرتا تھا تعلیم کو اپنا
دلچسپ ترین مشغلہ سمجھنے لگا۔ اس کے علاوہ اب ایک پروگرام بن گیا تھا۔ اس
وقت سو کر اُٹھنا۔ اس وقت ناشتہ کرنا۔ اس وقت غپ شپ۔ اس وقت
اسکول۔ اس وقت کھیل۔ گویا زندگی ایک باقاعدگی کے ساتھ ان ماسٹر صاحب
نے شروع کرا دی۔ وہ صرف ہماری کتابوں کے ذمہ دار نہ تھے۔ بلکہ ہمارے
لباس پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ ہماری غذا کی بھی ان کو فکر ہوتی تھی۔ ہمارے کھیل
کود کے انتظام بھی ان کے سپرد تھے۔ والد صاحب کو اب اطمینان تھا کہ
صاحبزادے ایک راستہ پر لگ گئے ہیں اور اب کسی نہ کسی دن منزل تک
پہنچ ہی جائیں گے۔ ماسٹر بخشش احمد صاحب اس حد تک ہمارے دوست

ہو چکے تھے کہ ان کو ہمارے گزشتہ عشق تک کی اطلاع تھی۔ اور وہ بھی کبھی کبھی اِس سلسلہ میں بات بھی کیا کرتے تھے۔ اپنے عشق کی کہانیاں سناتے اور اِس طرح ہم پر یہ واضح کرتے کہ یہ دراصل عشق نہیں بلکہ عشق کا ایک خاص کارانہ دھوکا ہوتا ہے جس کو انسان یاد تو ہمیشہ رکھتا ہے۔ مگر یہ یاد کبھی تڑپاتی نہیں۔ بلکہ یونہی ذہن میں ایک واقعہ کے طور پر محفوظ رہ جاتی ہے جس پر انسان بعد میں ہنستا بھی ہے اور کبھی کبھی اس سے سبق بھی لیتا ہے۔ ماسٹر صاحب شاعر تو نہیں تھے مگر شاعری کا شوق بہت تھا۔ اکثر شعراء کا کلام بڑا مزا لے لے کر پڑھتے تھے اور ان کے اس مزا لینے سے ہم کو بھی لطف آتا تھا شعر کو اس قدر مزیدار چیز ہم نے اب تک کبھی نہ سمجھا تھا۔ اب شعر میں ہم کو بھی مزا آنے لگا تھا۔ اور شعرا کا کلام ہم بھی بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ اور اس سے لطف لیتے تھے ایک دن ہم نے خود بھی شعر کہنے کی کوشش کی۔ اور تھوڑی دیر کی فکر کے بعد دو شعر کہے ؎

خدا اپنی خدائی لے کے بس ان کو مجھے دیدے،
میں سمجھوں گا اس نے اک خدائی مجھکو دے ڈالی
مری تخریب سے تعمیر کے پہلو بھی نکلیں گے
مجھے آراستہ کر دے گی اک دن ان کی پامالی!

ماسٹر صاحب کو یہ شعر سنائے تو وہ اچھل پڑے۔ کسی طرح ان کو یقین ہی نہ

آتا تھا کہ شعر ہم نے کہے ہیں وہ اس کو سرقہ سمجھ رہے تھے۔ مگر جب ان کو یقین ہو گیا۔ تو ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی اور ایک دم ان کو احساس ہوا کہ اس لڑکے میں پوری شاعرانہ صلاحیت موجود ہے بجائے اس کے کہ وہ ہمارا حوصلہ پست کرتے ہم کو انہوں نے پورا یقین دلا دیا کہ تم شاعر ہو۔ شاعر بھی بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے اور اُدھر ہم کو یہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ چور بھی بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ شعر واقعی ہمارے نہیں تھے ایک بہت پرانے رسالے سے نقل کر لیے تھے۔ مگر اسی واقعہ نے دراصل ہم کو شاعر بنانا شروع کر دیا۔

شوکت تھانوی

ان اشعار کو سننے کے بعد ماسٹر صاحب نے ہمارے لیے تخلص کی جستجو شروع کر دی۔ آخر ہم نے خود ان سے کہا کہ ہمارا تخلص شوکت رکھ دیجئے۔ کہنے لگے بہت اچھا ہے یہی سہی چنانچہ اب ہم محمد عمر ملقب بہ شوکت ہو گئے اور چونکہ ارشد تھانوی کی وجہ سے یہ معلوم تھا کہ ہم تھانوی بھی لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا شوکت تھانوی ہو گئے پرانے رسالوں سے شعر نقل کرنے کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ مگر اب ایک بات پیدا ہو گئی تھی کہ طبیعت میں شعر سے دلچسپی اور موزونیت کا احساس خود ہم کو ہونے لگا تھا۔ ایک آدھ مصرع کبھی کبھی خود بھی موزوں کر لیتے تھے۔ مگر وہ ہوتا تھا ایسا تھرڈ کلاس کہ انکو سنانے یا اپنا کہنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ ہمارے شاعر ہونے کی اطلاع

ہمارے ہم جماعتوں کو بھی ہو چکی تھی۔ اور ہم ان کو اپنا دیوان کلام جھوم جھوم کر نہایت خوش
آوازی کے ساتھ سنایا کرتے تھے اور ان پر اپنا رعب جماتے تھے ہمارے اردو
ٹیچر مولوی حفاظت علی صاحب بھی ہم کو نہایت قدر کی نظروں سے دیکھتے تھے اور
واقعی اس طرح چوری کرنے ہی کے طفیل میں کم سے کم استعداد اتنی بڑھ گئی تھی۔ کہ
اور باقی مضامین تو خیر جیسے کچھ بھی تھے ہم کو خوب معلوم ہے مگر اردو میں ہمیشہ اول نمبر
پاس ہوتے رہے اور ہماری اردو کی قابلیت ہمارے استادوں اور ہم سبقوں
نے ہمیشہ تسلیم کی مگر ایک دن ہماری شاعری کا بھانڈا خوب پھوٹا۔ ہم نے ایک
تازہ غزل اپنے احباب کو سنائی اور وہ ہمارے اردو ٹیچر مولوی حفاظت علی تک
پہنچی۔ خوب خوب ہم کو داد ملی۔ اور مولوی حفاظت علی صاحب نے ان الفاظ کے
ساتھ اعتراف کیا کہ بھائی خدا کی دین ہے۔ شاعر تلمیذ الرحمان ہوتا ہے۔ اور شاعر کا
کے لیے کسی عمر یا قابلیت کی قید نہیں وہ جس کو نواز دے۔ مگر دوسرے دن ہمارے
ایک ہم جماعت محمد ایوب حسن کمبخت جو آج کل اسی لکھنؤ میں سب انسپکٹر پولیس ہیں۔
نہ جانے کہاں سے وہ رسالہ لے آئے جس میں وہ غزل چھپی تھی۔ اور وہ رسالہ
مولوی حفاظت علی صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ مولوی صاحب نے
اس کو دیکھا اور بہت ہنسے لڑکوں نے ہم کو خوب بنا لیا۔ اور ہم اب شاعر تو شاعر
ایک معمولی انسان کی حیثیت سے بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھے۔ مگر اس
زمانہ میں غالباً غیرت داری بھی یوں ہی سی تھی۔ کچھ دن تک اس کا اثر رہا۔ دوستوں نے

مذاق اڑائے، استادوں نے ذلیل کرنے کی پوری کوشش کی، مگر ہم ذلیل ہونے پہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اور ہر چند کہ ہمارا ستارہ گردش میں آچکا تھا، مگر کچھ ہی دن کے بعد حالات اپنی معمولی رفتار پہ آگئے۔ البتہ اب میری شاعری کا سکہ کھوٹا ثابت ہو چکا تھا۔ اور پھر ہم کبھی یہ جرأت نہ کر سکے کہ اپنے کسی ہم جماعت کو اپنا کوئی شعر سنائیں خواہ وہ ہمارا ہی کیوں نہ ہو۔

پہلی غزل

چوری کھلنے کے اس واقعہ کے بعد ہم کو واقعی عبرت حاصل ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں ہم ایوب صاحب کے ہمیشہ کے لیے شکر گزار رہیں گے کہ اس نے شرارت سے کے پردے میں ہم سے بہت بڑی دوستی کی۔ چنانچہ ہم نے پھر کبھی کسی شاعر کا شعر نقل نہیں کیا۔ اور خود شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ معلوم ہوا کہ شعر کہنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ گھنٹوں غور کر کے ایک مصرعہ کہا بھی تو پتہ چلا کہ اس میں یا تو کچھ گھٹ گیا ہے یا بڑھ گیا ہے۔ اور گھنٹہ بھر اس کی کتر بیونت کی، راتوں کو بیٹھے مصرعے لکھ رہے ہیں اور کاٹ رہے ہیں اور والدین یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کا ہونہار امتحان کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اسی زمانہ میں بھائی جان ارشد تھانوی صاحب تشریف لائے۔ اور ان کو ہمارے اتالیق ماسٹر بخشش احمد صاحب نے ہماری شاعرانہ صلاحیت کی اطلاع دی تو ان

کو کسی طرح یقین نہ آیا۔ آپ نے امتحان لینے کے لیے ہم کو ایک مصرعہ دیا۔ ع

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

اور فرمایا کہ اس پر مصرعہ لگاؤ۔ ہم نے تھوڑی دیر میں اس پر مصرعہ تو نہیں لگایا بلکہ اپنے مصرعے پر اس کو لگا کر مطلع کر دیا۔ ؎

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
غمناک سیاہی رات کی تھی اب اس کا اندھیرا دور ہوا

بھائی جان نے جو یہ مطلع دیکھا ہے تو میں ان کی خوشی بیان نہیں کر سکتا۔ میری کسی صلاحیت پر میرے عزیزوں میں سے کوئی بھی اتنا خوش نہ ہوا تھا۔ اور خود میں بھی خوش تھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ بھائی جان نے یہ مطلع والد صاحب کو بھی سنایا مگر وہ سنی ان سنی کر کے ٹال گئے۔ غزل کی پوری [illegible] سے جو صدمہ پہنچا تھا اس کی تلافی ہو گئی اور شعر کہنے کی ایک نئی امنگ پیدا ہو گئی۔ اس کے تھوڑے دن بعد ہم نے ایک پوری غزل کہہ کر لکھنؤ کے ایک رسالے کو اس خوشامد کے ساتھ بھیج دی کہ اس کو چھاپ دیا جائے۔ امید تو نہیں تھی کہ چھپ جائے گی مگر ایک دن ڈاک میں ہمارے نام ایک رسالہ آیا جس پر پتہ لکھا ہوا تھا۔ شیخ محمد عمر صاحب شوکت تھانوی۔ کھول کر دیکھا تو وہی رسالہ۔ اس رسالہ کا نام بھی [illegible] لیجیے غزل چھپی نظر آ گئی پاکیزہ [illegible] ہم مبارک تھا اس رسالہ کا بھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ [illegible] نظر لکھنؤ پورا گویا اس کا تاریخی نام تھا۔ یہ رسالہ جو [illegible] مصطفےٰ خاں صاحب اصطفا

مالک کارخانہ معطر علی محمد علی تاجرانِ عطر کے زیرِ اہتمام نکلتا تھا۔ اور اس کے ایڈیٹر گویا مولوی برکات احمد صاحب تھے۔ رسالہ کو الٹ کر دیکھا تو فہرست مضامین ہمارے نام سے جگمگا رہی تھی عجیب اضطراب کے عالم میں رسالہ کے صفحات الٹے پلٹے اور اپنی غزل اور غزل کے اوپر اپنا نام جلی حروف میں دیکھ کر ایک دم ایسا محسوس ہوا کہ گویا زندگی میں کوئی بہت بڑا انقلاب آگیا ہے۔ بار بار غزل کو پڑھتے تھے اپنا نام پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس روز ہمارے خون میں نمایاں اضافہ ہوا ہوگا۔ آخر ہم نے دوسروں پر اپنی شاعری کا سکہ جمانے کے لیے رسالہ کا وہی صفحہ کھول کر کمرہ میں ایک ایسی جگہ رکھ دیا کہ ہر شخص کی اس پر نظر پڑ سکے اور پھر اس طرح دور بیٹھ کر اس کی نگرانی کرنے لگے جیسے کوئی چڑیمار دانہ میں روئی لگا کر چڑیوں کے پھنسنے کا انتظار کرتا ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس دن رسالہ پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ اور ہمارا یہ انتظار بالکل بیکار گیا۔ دوسرے دن ہم نے رسالہ کی جگہ بدل دی۔ اور پھر کانٹے میں چارہ لگا کر مچھلی پھانسنے کے انداز سے دور جا بیٹھے۔ سب سے پہلے والد صاحب کی نظر رسالہ پر پڑی اٹھا کر اسے دیکھا۔ دیکھ کر کچھ ٹھٹکے اور پھر بیٹھ کر انہوں نے عینک لگا کر غور سے پڑھا اور پھر نہایت شوخی کے ساتھ رسالہ کو میز پر رکھ کر والدہ صاحبہ کو آواز دی۔

ارے میں نے کہا سنتی ہو

آواز آئی "لا رہی ہوں پان وا!"

جواب دیا" اجی پان نہیں ذرا یہاں آجاؤ۔

والدہ صاحبہ تشریف لائیں تو آپ نے نہایت اطمینان سے بیٹھ کر کہا۔

"یہ آپ کے صاحبزادے کا کلام ایک رسالہ میں چھپا ہے"۔

والدہ صاحبہ نے یقین نہ کرتے ہوئے نون کو کھینچ کر کہا۔ "ہوں"

والد صاحب نے رسالہ دکھاتے ہوئے کہا۔ دیکھ لو نا۔ فرماتے ہیں صاحبزادے کہ

ہمیشہ غیر کی عزت تری محفل میں ہوتی ہے
ترے کوچہ میں ہم جاکر ذلیل و خوار ہوتے ہیں

سوال یہ ہے کہ آخر یہ جاتے ہی کیوں ہیں۔ اور کس سے پوچھ کر جاتے ہیں"

والدہ صاحبہ بیچاری نہایت معصوم سمجھیں کہ لڑکے کی کوئی چوری پکڑی گئی ہے گھبرا کر بولیں "مجھے تو جانے آنے کی کوئی خبر نہیں"۔

والد صاحب ہنس دیئے۔ اور فرمایا" شوق برا نہیں ہے مگر ذرا قبل از وقت ضرور ہے"۔

ہم دور بیٹھے یہ سب باتیں سن رہے تھے اور اندازہ کر رہے تھے کہ والد صاحب اگرچہ اپنی خوشی دبانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر دراصل بہت خوش ہیں بار بار رسالے کو دیکھنا اور پھر رکھ دینا بلا وجہ تو ہو نہیں سکتا۔ مگر اس سلسلہ

میں والد صاحب نے ہم کو کچھ نہ کہا۔ ہماری یہ غزل بہت سی خوبیوں کی آئینہ دار تھی۔ مثلاً ایک تو اس میں شعر ہی ایسے بلند تھے کہ ہم اپنے منہ سے کیا تعریف کریں دوسرے عروض کے بڑے بڑے کمالات ان میں موجود تھے مثلاً مقطع ملاحظہ ہو ؎

شفا پاتے ہوئے ان کو نہیں دیکھا کبھی شوکت

جو عشق مرض مہلک کے کبھی بیمار ہوتے ہیں

تخیل کی بلندی پر غور نہ کیجئے اور نہ اس طبی مسئلہ کو میڈیکل کونسل کے سامنے لانے کی فکر کیجئے کہ عشق کے بیمار شفایاب کیوں نہیں ہوتے بلکہ اس میں لفظ "مرض" کے حسن کو ملاحظہ کیجئے کہ کس حسن سے نظم ہوا ہے مرض۔ بفتح اول و دوم سب ہی استعمال کرتے ہیں۔ مگر شاعر ترچھی نظر طبع لکھنؤ نے مرض کی رے کو بعض بنا کر استعمال کیا ہے یہ کمالات اب کہاں نظر آتے ہیں۔

بارود کو دیا سلائی

اس غزل کے چھپنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تمام ادبی صلاحیتیں ایک مرتبہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔ اب غزل پر غزل کہنے لگے اور مارے غزلوں کے "ترچھی نظر" کا دفتر پاٹ دیا۔ کبھی کبھی کوئی غزل چھپ جاتی تھی اور باقی ردی کی ٹوکری میں بھیج جاتی ہوں گی۔ ترچھی نظر کا فائل ہم کو جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس لئے کہ اس میں ہمارا کلام چھپا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں ہماری واحد دلچسپی یہی ادبی انہماک

تھا۔ غرض یہ کہنے کے علاوہ ترچھی نظر کے افسانے پڑھ کر ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم خود کیوں نہ کہانیاں لکھیں۔ چنانچہ بہت ڈرتے ڈرتے ایک افسانہ لکھ کر ترچھی نظر کو بھیجا اور ہم کو تعجب ہوا کہ وہ افسانہ من وعن چھپ گیا۔ دوسرا افسانہ، تیسرا افسانہ اور چوتھا افسانہ ہر افسانہ چھپ جایا کرتا تھا۔ یعنی شاعر تو تھے ہی افسانہ نگار بھی بن گئے اور ہماری ادبی زندگی کا یہ بچپن نہایت طوفان خیز امنگوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔ رہ گیا پڑھنا لکھنا وہ یونہی برائے نام تھا۔ یہ تو سب دیکھتے تھے کہ آدھی آدھی رات تک ہم لکھ پڑھ رہے ہیں۔ مگر یہ کسی کو کیا معلوم کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ اسی زمانہ میں ہم نے اپنے اسکولی دوستوں کے لیے ایک قلمی رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ اس رسالہ کو خود نہایت خوشخط لکھتے تھے۔ اس میں کارٹون بنائے جاتے، نظمیں ہوتی تھیں اور احباب پر چوٹیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ قلمی رسالہ حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھا۔ اس کا ہر نمبر جو صرف ایک ہی ہوتا تھا، احباب کے یہاں ایک ایک دن مہمان رہتا تھا اور گشت ختم کر کے پھر ہمارے پاس آجاتا تھا۔ پندرہ دن کے بعد دوسرا نمبر نکلتا تھا مگر اس کے غالباً چار ہی پانچ نمبر نکل سکے مختصر یہ کہ اسکول میں بھی یہی مشغلہ تھا اور گھر پر بھی یہی والدین کچھ پڑھا رہے تھے اور بلند اقبال کچھ پڑھ رہے تھے۔ من چہ می سرایم و تنبورہ من چہ می سراید۔

شادی کا ذکر

تعلیم سے فراغت کا آخر کہاں تک انتظار کیا جاتا۔

ارمان بھری ماں بیٹے کا سہرا دیکھنا چاہتی تھی۔ اور باپ کو
جس طرح گھر کی ہر اور بات کی فکر نہ تھی۔ اسی طرح
بہو لانے کی طرف سے بھی غافل تھے۔ آخر والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو راضی
کرلیا کہ اب لڑکے کی شادی کر دی جائے۔ والد صاحب بھوپال والے واقعہ
اور اس سلسلہ میں اپنی سختی کو بھولے نہ تھے بلکہ اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے
چنانچہ حکم دے دیا، صاحبزادے دور اور نزدیک کے رشتہ داروں کے یہاں جائیں
اور خود یہ بتائیں کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم
اپنے ننھیال ملاوان ضلع ہردوئی بھیجے گئے۔ وہاں ہماری خالہ تھیں اور ان کی
تین لڑکیاں تھیں۔ ہمارے نزدیک انتخاب۔ کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ شادی کیلئے
صرف ایک لڑکی ہونی چاہیئے تھی، جو بظاہر لولی لنگڑی وغیرہ نہ ہو اور زیادہ
تر مطلب تو اس بات سے تھا کہ ایک عورت اپنی تمام امیدیں ہم سے وابستہ
کرسکے ہم کو اپنا مالک و مختار بلکہ مجازی خدا بنائے۔ شادی کا تصور اب نئی
صورت میں ہمارے سامنے تھا کہ ایک عورت ہو جو پھولوں میں لدی عطر میں بسی
پاندان کھولے اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے ہمارے لیے پان بنا رہی ہے اور دوپٹہ
کی اوٹ سے ہم کو دیکھتی جاتی ہے۔ اپنا سمجھ کر اور اپنے کو ہماری سمجھا کر
لوگ اس عورت کو ہماری بیوی کہہ رہے ہیں۔ اس عورت کے گھر والے
ہم کو دولہا میاں سمجھ رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ شادی سے زیادہ ہم کو اس اقتدار

کی تمنا تھی۔ جو شوہر بن جانے کے بعد ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے سسرال
کی آؤ بھگت، سالیوں کا حسین مذاق۔ ساس اور سسر کی نیاز مندیاں سسرال
کے دوسرے عزیزوں کی پرستاریاں ان سب کا انتظار تھا چنانچہ ہم ملاوان
گئے اور ان میں سے ایک لڑکی پسند کر آئے اور ہمارے شیخ جی کے وہاں کہہ بھی
آئے کہ ہم اس گھر کو اپنی سسرال بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں، گھر آکر والدہ صاحبہ
کو اپنے انتخاب کی اطلاع دی۔ والد صاحب نے سنا تو وہ اس فیصلہ سے مطمئن
نہ ہوئے، بلکہ والدہ صاحبہ کو سمجھا دیا کہ یہ فیصلہ جلد بازی کا ہے، ان حضرت کو
باقی عزیزوں کے یہاں بھی بھیجا جائے تاکہ یہ اطمینان سے کوئی فیصلہ کر لیں لہٰذا
ہم اب کی مرتبہ مین پوری بھیجے گئے جہاں ہمارے ایک قریبی رشتہ کے خالہ
زاد بھائی حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب مشن ہائی سکول میں عربی اور فارسی کے
انچارج بھی تھے اور مطب بھی کرتے تھے یہاں ہم حسن صاحبزادی کو دیکھنے آئے
تھے ان کو دیکھ کر آنکھوں کا نور اور دل کا سرور حاصل ہوا طبیعت باغ باغ ہو گئی،
اور ملاوان جا کر جو فیصلہ کیا تھا اس پر اپنے احمق ہونے کا سچے دل سے اعتراف
کیا۔ ایک عجیب گڑیا سی لڑکی بھولا بھولا چہرہ پیاری پیاری باتیں، پڑھی لکھی، نمازی
پرہیزگار۔ ہنس دے تو منہ سے پھول جھڑنے لگیں رو دے تو ــــ مگر روئے اس
کی بلا۔ دور پار بلائیں چھوٹیں مختصر یہ کہ دل نے کہا کہ اے میاں شوکت اگر یہ
بن جائے تمہاری دلہن تو کیا کہنا ہے زندگی سدھر جائے گی، گھر میں لکشمی آجائیگی

غریب آدمی کی لڑکی ہے تم بھی غریب زادے ہو مگر فرق دیکھو کہ تم تو صورت سے فقنٔے معلوم ہوتے ہو اور یہ تخت طاؤس نظر آرہی ہے۔ کیا وقار ہے کیا تمکنت ہے معلوم ہوتا ہے کسی صوبہ کی گورنری کا چارج لے کر باورچی خانہ میں ماش کی دال دھو رہی ہے۔ آنکھوں کو دل کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق تھا اور دماغ ان تدابیر پر غور کر رہا تھا کہ کیونکر اس تیلی کو پکڑا جائے۔ ایک دن کے ارادے سے آئے تھے، مگر تین دن رہے اور تینوں دن اس طرح ختم ہو گئے، گویا تین چٹکیاں کوئی بجا دے، اپنی آنکھوں میں ان کو بسا کر اپنے دل میں ان کو رچا کر لکھنؤ آ گئے۔ اور والدہ صاحبہ سے کہہ دیا کہ اب کی مرتبہ ہم نے واقعی آپ کے لیے بہو ڈھونڈلی ہے۔ اور ہمارا یہ انتخاب آخری اور قطعی ہے، والدہ صاحبہ نے ہم کو "چل ہٹ" کہہ کر اس مرتبہ بھی معتبر نہ سمجھا۔ اس لئے کہ ہم علاوان گئے وہاں سے آ کر رضامندی ظاہر کر دی، ملیح پوری گئے وہاں سے آ کر اپنی پسند کا اظہار کر دیا، آخر وہ بیچاری ہماری کس پسند کو قابلِ اعتبار سمجھیں۔ مگر کچھ دن تک جب ہم کو اس سلسلہ میں مستقل مزاج پایا اور ہماری پسند کے علاوہ ایک خاص بے قراری کا اندازہ کیا تو والد صاحب سے کہہ کر ہمارا باقاعدہ پیغام مین پوری بھجوا دیا گیا۔ وہاں سے جواب آ گیا کہ شادی میں تو کوئی عذر نہ ہوتا مگر پہلے بڑی لڑکی کا عقد ہو جائے اس کے بعد منجھلی کی نسبت پر غور کیا جائے گا۔ دوسرے لڑکا کم سے کم انٹرنس تو پاس ہو جائے؂

داڑھی

شادی کے سلسلہ میں تو ہمارے بزرگ خط و کتابت کرتے رہے ادھر ہم اپنے ادبی اور برائے نام تعلیمی مشاغل میں مصروف ہو گئے، اس زمانہ میں تحریک ترک موالات کا بہت زور تھا۔ اسکولوں کے بائیکاٹ ہو رہے تھے، ہمارے اسکول میں بھی اس تحریک نے زور پکڑا، مگر خیر تعلیم تو ہم کیا چھوڑتے مگر کچھ نہ کچھ تو چھوڑنا چاہیئے ہی تھا لہٰذا ہم نے معلوم نہیں کس اثر کے ماتحت داڑھی چھوڑ دی اور سر کے انگریزی بال خشخشی کرا لیے، گاڑھے کے لمبے لمبے کرتے بنوائے، گاڑھے کے پاجامے اور گاڑھے کی ٹوپی، پیر میں خاص گنوارو جوتا اور اسی سج دھج سے اسکول جانے لگے، کچھ دن تک لوگوں کو تشویش رہی کہ شاید دماغ پر کوئی ناگوار اثر پڑ گیا ہے، پھر لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا، مگر یہاں

گھٹا کی عقل اور داڑھی بڑھا کی

تھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی نورانی داڑھی چہرے پر لہلہانے لگی۔ ہم کو اتنا ضرور یاد ہے کہ یہ انقلاب سیاسی ماحول کے ماتحت ضرور ہوا تھا مگر اس کا کسی سیاسی دلچسپی سے کوئی تعلق نہ تھا، جو کچھ بھی ہو۔ اسی وضع قطع کے ساتھ ایک سال کا زمانہ گذرا، پھر رفتہ رفتہ اپنے قرینے پر آنے لگے، کھدر کا کرتا چھوڑا قمیض پہنی، شیروانی کا اضافہ کیا۔ کھدر کے پاجامے کی طرح چھالٹین کے پاجامے

استعمال کرنے لگے، اور اسی طرح طبیعت روبصحت ہوتے ہوتے مکمل طور پر صحت یاب ہو گئے، مگر داڑھی اپنی جگہ پر قائم تھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ داڑھی شادی کرنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ اس لیے کہ حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب ایک مستند عالم ہی نہیں بلکہ عملی طور پر نہایت پکے مسلمان تھے، خود ان کے چہرے پر جو داڑھی تھی ویسی داڑھیاں سرسید کے بعد ذرا مشکل سے نظر آتی ہیں مگر لوگوں کا یہ خیال غلط تھا یہ داڑھی شادی کے سلسلہ کی کوئی چیز نہ تھی اور نہ سسرالی اثر کے ماتحت تھی۔

شادی

آخر کار ہمارے بزرگوں نے حکیم مولوی محمد سجاد حسین صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا کہ آپ نکاح کر دیجئے، لڑکی کو رخصت نہ کیجئے گا۔ تاوقتیکہ آپ کی شرط پوری نہ ہو جائے یعنی لڑکا انٹرنس پاس نہ کرے، اور اس کے علاوہ ان پر ایسا زور دیا گیا۔ کہ وہ بیچارے بڑی لڑکی کے عقد سے پہلے ہی منجھلی لڑکی سے عقد پر راضی ہو گئے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں حکیم صاحب قبلہ کا تمام خاندان لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ اور حکیم صاحب کے برادر عزیز مولوی محمد عثمان صاحب احمدی کے یہاں سب مقیم تھے طے یہ ہوا کہ یہیں عقد ہو جائے پھر رخصتی باقاعدگی کے ساتھ ہوتی رہے گی۔ یہ واقعہ ہے ۱۹۲۴ء کا۔ چنانچہ دن تاریخ سب طے ہو جانے کے بعد

نہایت سادگی کے ساتھ ہم خود ماموں صاحب اور والد صاحب کے ہمراہ رحمت منزل احاطہ خام فقیر محمد خاں پہنچے، اور خود ہمارے خسر صاحب نے ایک قریبی مسجد میں اپنی صاحبزادی کا نکاح ہمارے ساتھ پڑھ دیا۔ اس وقت دولہا کے چہرے پر داڑھی تھی اور غالباً اسی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ داڑھی کی ہی کرامت ہے کہ حکیم صاحب قبلہ نے انٹرنس پاس ہونے کی سخت شرط اور بڑی لڑکی کے عقد نہ ہونے کی تمام رکاوٹوں کے باوجود اس داڑھی کے زیرِ سایہ عقد پڑھ دیا۔

لیجئے صاحب شادی بھی ہو گئی اور یہ ہی پوری کی اسی ساحرہ کے ساتھ شادی ہوئی جس کے لیے اس قدر بے قرار تھے۔ سعیدہ سجاد اب مسز سعیدہ شوکت تھانوی ہو گئیں۔ مگر اب تک ہم دونوں کے درمیان وہ شدید پردہ تھا کہ کیا کسی نامحرم سے وہ اس قدر چھپائی جاتی ہوں گی مگر اب چونکہ ہماری آمد و رفت رحمت منزل میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، لہٰذا کبھی کبھی ایک آدھ جھلک ہم بھی ان کی دیکھ لیتے تھے، جو ہماری تھیں اب تک تو صرف یہی تمنا تھی کہ وہ ہماری ہو جائیں مگر اب یہ الجھن کہ ہماری ہو کر بھی ہم سے دور رہیں۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ اطمینان بھی تھا کہ ؎

عقد جب ہو ہی چکا ہے تو اب انشاءاللہ
کچے دھاگے میں چلی آئیں گی سرکار بندھی

ایک حادثہ

اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کی جوبلی منائی جا رہی تھی اور والد صاحب قبلہ علی گڑھ گئے ہوئے تھے۔ وہاں آپ نے یکایک یہ رائے قائم کر لی کہ ہم کو علی گڑھ ہی میں داخل کر دیا جائے، چنانچہ ہم کو علی گڑھ سے تار دیا کہ تم فوراً آجاؤ۔ اور جوبلی اور جوبلی کے جشن کی سیر کرو۔ تار ملتے ہی ہم علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ علی گڑھ رات گئے پہنچے اور سیدھے اسی ہوسٹل میں پہنچے جہاں والد صاحب مقیم تھے۔ آپ وہاں اپنے کسی دوست کے صاحبزادے کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے جو علی گڑھ میں قانون کا مطالعہ کر رہے تھے۔ چنانچہ جس وقت ہم پہنچے ہیں والد صاحب نے فرمایا کہ تم اپنا بستر بندھا رہنے دو۔ میرے دوست کے لڑکے میاں حلیم کا یہ بستر بچھا ہے۔ اسی پر سو رہو۔ وہ کسی کانفرنس میں گئے ہوئے ہیں۔ اور غالباً بہت دیر میں آئیں گے وہ آکر دوسری چارپائی کا انتظام کر لیں گے۔ اور تمہارا بستر بچھا کر سو رہیں گے۔ چنانچہ ہم نے اس حکم کی تعمیل میں حلیم صاحب کے بستر کو اپنا لیا اور سو گئے مگر ابھی غالباً نیند آئی ہی تھی کہ خواب میں دیکھتے کیا ہیں کہ ہم علی گڑھ آئے ہیں اور والد صاحب نے ہم سے وہی باتیں کہی ہیں جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، لہٰذا ہم سونے کی نیت کرنے سے پہلے غسل خانہ گئے ہیں تاکہ ضروریات سے فارغ ہو لیں اور ضروریات میں سے صرف ایک ضرورت ہے گویا ہم فارغ ہو رہے ہیں۔ یکایک آنکھ کھل گئی۔ حلیم صاحب

کا تمام بستر تر بتر خود ہم اپنی اسی صورت میں ڈوبے ہوئے۔ دم ہی نکل گیا کہ یا اللہ اب کیا ہوگا۔ پرایا بستر علی گڑھ کی فضا ہماری یہ عمر، چہرے پر نورانی داڑھی۔ شادی شدہ اور یہ بچوں کی سی حرکت مگر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو ہی چکا تھا اور سوال یہ تھا کہ آخر کریں تو کیا کریں۔ سردی میں اس قدر جلد بستر خشک نہیں ہو سکتا تھا۔ بستر سے اٹھتے ہیں تو سرہی پر والد صاحب سو رہے ہیں ان کو خبر ہو جائے گی۔ جس قدر غور کرتے ہیں اسی قدر رسوائی کے امکانات واضح ہوتے جاتے ہیں۔ بھاگ سکتے نہیں آسمان دور اور زمین سخت والا معاملہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ ساری رات اسی فکر و تردد میں گزری کہ تقریباً ساڑھے چار بجے حلیم صاحب کانفرنس سے واپس آئے۔ ہم نے اسی عالم میں کہا۔ "السلام علیکم آپ عین وقت پر آ گئے۔"

حلیم صاحب نے نہایت اخلاق سے کہا "کیوں کیوں خیریت"۔

عرض کیا "سردی میں بستر چھوڑنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے اور پیاس ہے کہ گویا آج تک کر کر نہ لگے گی۔"

حلیم صاحب نے فوراً ایک گلاس پانی ہم کو دے دیا مگر وہ ابھی دینے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے وہی گلاس بستر پر الٹ لیا اور "ارے" کا نعرہ بلند کر کے کھڑے ہو گئے۔ حلیم صاحب نے اس کو اپنی غلطی سمجھ کر ہم سے معافی مانگی اور ہم نے فراخدلی سے کام لے کر ان سے کہہ دیا کہ کوئی ہرج نہیں جب بستر موجود ہے اس کو بچھائے لیتے ہیں۔ اور دونوں اسی پہ سو رہیں گے۔ ہم

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

یہ ترکیب پہلے سے ذہن میں نہیں آئی تھی، بلکہ حلیم صاحب کی صورت دیکھتے ہی ایک دم یہ پلاٹ ذہن میں آگیا اور جان بچ گئی ورنہ علی گڑھ میں تو نالی پٹ جاتی بلکہ والد صاحب بھی زندہ نہیں تھے، نالی تو نالی ہم خود بھی پٹ جاتے۔

جوبلی کی سیر

جوبلی میں اپنے بہت سے دوست مل گئے امین سلونوی۔ وصل بلگرامی پیرزادہ فدا حسین، ساغر نظامی اور مولانا سیماب وغیرہ۔ ساغر صاحب تو سیماب صاحب کے پیارہ تک سٹال میں چھپے ہوئے تھے، امین سلونوی اور وصل بلگرامی مرحوم ہمارے ساتھ رہے۔ وصل بلگرامی نے وہاں کے ڈائننگ کیمپ میں اپنا کچھ ایسا رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ منتظمین خود ان کو منتظم سمجھتے تھے حالانکہ کسی سے وصل صاحب پہلے سے واقف نہ تھے۔ پہلی ہی مرتبہ کھانا کھانے گئے تھے کہ کھانا کسی بد انتظامی پر ایک دم بھڑ گئے اور منتظمین کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ کہ اگر یہی حال ہے تو لوگوں کا تو تم سب کو بدنام کرو گے لاؤ ادھر سے پلیٹیں میں دیکھتا ہوں۔ صرف دو خدمتگار ادھر بھیج دو۔ باقی اُس طرف کا انتظام تم دیکھو میں یہاں موجود ہوں۔ اس دعوے اور اس استحقاق کے ساتھ ظاہر ہے کہ کوئی غیر متعلق آدمی احکامات دے ہی نہیں سکتا تھا نتیجہ یہ کہ وصل صاحب کے

اشاروں پہ، امین صاحب کی ہدایتوں پہ اور ہمارے احکامات پہ ڈائننگ کیمپ کے تمام لوگ ناچے ناچے پھرتے تھے۔ جس کو جہاں چاہا تعینات کر دیا۔ جس سے جو کام چاہا لے لیا۔ اور پھر لطف یہ کہ سات روز تک صبح اور شام دونوں وقت اچھے سے اچھا کھایا۔ اور چونکہ ہم خود منتظم تھے۔ لہٰذا قیمت کا تو کوئی سوال ہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ تو ہم نے ایک دوست کی اسی ڈائننگ کیمپ میں دعوت بھی کر دی، اور کچھ خرچ بھی نہ ہوا۔ کھانے کی طرف سے یہ انتظام حسبِ دلخواہ ہو ہی گیا تھا۔ لہٰذا بے فکری کے ساتھ جشن کی مختلف تقریبات میں حصہ لیتے رہے اور جوبلی کا وہ تاریخی مشاعرہ بھی دیکھا۔ جس کے بعد سے شاعر علی گڑھ کا نام سن کر اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عجیب طوفان خیز مشاعرہ تھا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مشاعرہ کی صدارت کر رہے تھے۔ خواجہ مسعود علی صاحب ذوقی مشاعرے کے سیکرٹری تھے۔ ہر طرح کوشش کی جا رہی تھی کہ کسی طرح طلباء اپنی ذہانت کا تختۂ مشق شعرائے کرام کو نہ بنائیں۔ مگر توبہ کیجئے کہیں علی گڑھ کے لڑکے ماننے والے تھے۔ ایک صاحب نے خواندگی سے قبل فرمایا کہ حضرات میں صرف تین شعر پڑھنا چاہتا ہوں سکون سے سن لیجئے۔ منتظر کہ آواز آئی "ارشاد" شاعر نے مطلع پڑھا تو داد کے بجائے پورا پنڈال چیخ اٹھا۔ "ایک" دوسرا شعر پڑھا تو سب نے ہم آواز ہو کر کہا "دو" تیسرا شعر پڑھا تو سب نے نعرہ بلند کیا "تین" چوتھا شعر پڑھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ لائٹ گل۔ اور ایک ہلڑ۔ ایک غدر ہو رہا تھا گو جبہ باندھے ڈائس پر

تشریف لائے۔ سیکرٹری نے تعارف کرایا تو ایک آواز بلند ہوئی "حضرت کا منہ کدھر ہے؟" اور واقعی گلوبند اس شان سے بندھا ہوا تھا کہ بغیر بتائے منہ کا پتہ چلنا دشوار تھا۔ ایک بزرگ نے غالباً یہ ترکیب مناسب سمجھی کہ اگر میں نعتیہ کلام پڑھوں گا تو کسی کو تمسخر کا موقع نہ ملے گا۔ لہٰذا آپ نے پہلا ہی نعتیہ مطلع پڑھا تھا کہ کسی نے پکار کر کہا۔ "اس کا اجر آپ کو خدا دے گا۔ تشریف رکھیے۔" مختصر یہ کہ کوئی شاعر ایسا نہ گیا جو کوئی نہ کوئی ریمارک لے کر واپس نہ آیا ہو۔ بہت سے شاعروں نے اپنا کلام سنانے سے انکار کر دیا۔ اور جو ایسے ہی اسٹیج پر تھے وہ ڈائس پر گئے۔ اور کچھ نہ کچھ سن کر واپس آ گئے۔ اس مشاعرے کے بعد سے علی گڑھ کی یونیورسٹی کے مشاعرے بہت بدنام ہو گئے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ اثر ختم ہو گیا۔ اور پھر کسی مشاعرے میں شعرائے کرام کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوا۔

علی گڑھ سے واپسی

علی گڑھ سے واپسی کے بعد علی گڑھ کا کورس خرید لیا گیا۔ اور خاص طور پر امتحان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ طے یہ ہوا تھا۔ کہ ایک سال تک گھر ہی پر پوری تیاری کر کے ایک دم علی گڑھ سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے دیں گے۔ اس مرتبہ ہم خود سنجیدہ تھے۔ اس لیے کہ اب ذمہ داری کا احساس بھی بڑھ رہا تھا اور سعیدہ اور اپنے درمیان سے اس انٹرنس والی شرط کو بھی ہٹانا تھا۔ لہٰذا زندگی میں پہلی مرتبہ سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اِدھر اُدھر جا کر پڑھا۔ چونکہ تمام مضامین سوائے اردو،

فارسی اور انگریزی کے بجائے گمزور تھے خصوصاً ریاضی۔ لہذا بہت سخت محنت کرنا پڑی رات رات بھر جاگتے تھے دن دن بھر محنت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب پوری طرح خود اپنے اطمینان کے قابل تیار ہو گئے۔ تو یکایک بیمار پڑ گئے۔ بخار آیا۔ اور جم کر رہ گیا۔ اور نہایت خطرناک طریقہ پر ٹمپریچر بڑھنے اور گھٹنے لگا یعنی دن بھر کم اور شام کو زیادہ، ایک مہینہ اسی طرح ہو گیا۔ دوسرا مہینہ گذرا۔ اور آخر کار ڈاکٹروں نے یہ خبر سنادی کہ دق ہو چکی ہے۔ لڑکے کو بھوالی سینی ٹوریم بھیجا جائے۔ والدین کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مگر خان بہادر ڈاکٹر عبدالحمید صاحب اس رائے سے متفق نہ تھے۔ اور وہ اب تک کبھی مختلف معائنے کر رہے تھے۔ کبھی تھوک دیکھتے۔ کبھی خون اور کبھی ایکسرے کراتے۔ آخر ایک دن انہوں نے فرمایا کہ رات کو بارہ بجے ان کا خون نکالا جائے۔ پھر اس کو دیکھوں گا۔ چنانچہ رات کے بارہ بجے یہ "شب خون" ہوا۔ اور دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کے لیے بھیج دیا گیا۔ سہ پہر کو ڈاکٹر صاحب بغیر بلائے خود ہی آ گئے۔ ان کے چہرے پر اس وقت مارے خوشی کے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ آتے ہی آپ نے نعرہ بلند کیا۔ "میری رائے صحیح نکلی۔ دق ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس مرض کا نام ہے فائلیریا (FILARIA) اور اس کے جراثیم رات کو بارہ بجے خون میں گردش کرتے ہیں۔ دن بھر تلی میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا مرض ہوتا ہے معلوم ہوا کہ اس سے گھینگا نکل سکتا ہے فیل پا ہو سکتا ہے وغیرہ۔ مگر اس کا

علاج ہو جائے تو کچھ نہیں ہوتا۔ یہ حضرت کبھی گورکھپور کی طرف گئے ہیں۔ اور وہاں سے یہ مرض لگا لائے ہیں۔ ہم واقعی گورکھپور کی طرف گیا معنی خود گورکھپور گئے تھے۔ اور وصل صاحب بلگرامی کے یہاں سے یہ مرض لے کر آئے تھے۔ چنانچہ اب مرض کی تشخیص ہو جانے کے بعد علاج بالکل آسان ہو گیا کلکتہ سے انجکشن منگائے گئے۔ اور تقریباً پچیس تیس انجکشن ٹھوکے ہوں گے۔ کہ ہم صحت یاب ہو گئے۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ سال خراب ہو گیا اور تیاری کر چکنے کے باوجود امتحان نہ دے سکے۔ اس علالت کا فائدہ یہ ضرور پہنچا کہ داڑھی منڈ گئی۔

والد صاحب کی علالت

ہم اچھے ہوئے ہی تھے کہ والد صاحب کے سرطان کا پھوڑا نکل آیا۔ عرصہ سے پیشاب میں شکر آتی تھی۔ مگر پرہیز کبھی نہ کیا۔ ڈاکٹر کہا کرتے تھے کہ آپ زمین کے نیچے کی ترکاریاں کھائیں۔ تو جواب ہمیشہ یہی دیتے تھے کہ کیا تارے کا شوربہ کھایا کروں یا آسمان کے ستاروں کی بھجیا۔ شکر اور مٹھائی تک کھانا نہ چھوڑی۔ شکر پر پابندی عاید ہوئی تو فرمایا کہ بہتر ہے میں گڑ کھایا کروں گا۔ مختصر یہ کہ کبھی کسی پرہیز کیلئے تیار نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ کاربنکل نکلا اور اس کا نہایت خوفناک اپریشن ڈاکٹر حافظ حفیظ الحق صاحب نے کیا۔ تقریباً آدھ سیر گوشت کاٹ کر پھینک دیا۔ زخم کا قطر ایک بڑے گھڑے کے دہانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مگر اتنا بڑا اپریشن کرانے کے بعد بھی ان

کے چہرے پر کمزوری کی کوئی علامت پائی نہ جاتی تھی۔ ڈنگس ہاسپٹل کے پرائیویٹ وارڈ میں رکھے گئے۔ اور ان کی تیمارداری میں ماموں صاحب اور ہم شب و روز مصروف رہے۔ اسی علالت کے زمانہ میں ایک روز جب کہ ہم ان کا بیڈ پاٹ صاف کر رہے تھے اور پاخانہ کا برتن صاف کر کے رکھ چکے تھے۔ ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ اسی دن کے لیے لوگ اولاد کی تمنا کرتے ہیں۔ کم سے کم میرے لڑکے نے حق ادا کر دیا۔ ماموں صاحب نے جو کبھی کسی بچے کی تعریف کرنا گناہِ عظیم سمجھا کرتے تھے۔ آج پہلی مرتبہ فرمایا کہ اس لڑکے نے ایسی خدمت کی ہے۔ کہ میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ اور یہ انشاء اللہ بڑی ترقی کرے گا۔ اس وقت والد صاحب ہماری طرف کچھ ایسی پیار کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ ہم ضبط نہ کر سکے اور رو دیئے۔ والد صاحب نے پیار سے کہا۔ "بیوقوف ہُوا ہے۔ ارے اب میں اچھا ہوں۔" مگر دراصل وہ اچھے تھے نہیں۔ اتنا بڑا زخم اگر معمولی حالات کے ماتحت برابر مندمل ہوتا رہتا تو بھی کم سے کم ایک مہینہ سے پہلے وہ بستر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور اسی قدر وقت کمزوری اور بیماری کے اثرات دُور ہونے کے لیے درکار تھا۔ مگر یہاں تو حال یہ تھا کہ آج زخم میں یہ خرابی ہو گئی۔ کل یہ نقص پیدا ہو گیا۔ ایک مرتبہ زخم میں زہریلے چھالے پڑ گئے اور ڈاکٹر صاحب بھی سخت بدحواس ہو گئے۔ کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ مگر خدا نے فضل کیا۔ اور دوسرے ہی دن حالت سنبھل گئی۔ ہم مسلسل والد صاحب کے ساتھ رہے۔ اور ان کو بھی

کسی ملازم کی کسی خدمت کار کی یہاں تک کہ نہتر تک کی ضرورت محسوس نہ ہونے دی۔ حالانکہ ملازم برابر موجود رہتا تھا۔ مگر مجھے اس پر اعتبار نہ تھا۔ اِس لیے کہ اس کے دل کو نہ لگی تھی۔ وہ تو محض تنخواہ پانے کے لیے یہ خدمت کر دیتا۔ ہم کو خود والد صاحب کا ہر کام کر کے ایک اطمینان سا محسوس ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے دو مہینہ کے بعد زخم قریب قریب مندمل ہو گیا۔ اور ڈاکٹر سے لڑ جھگڑ کر آپ اس دعدے پر گھر آ گئے۔ کہ باقاعدہ احتیاط کے ساتھ گھر ہی پر ڈریسنگ کرائیں گے۔ مگر گھر پر اگر علاج میں اپنی رائے سے ردّ و بدل کرنے لگے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زخم مکمل طور پر بہت دنوں میں ٹھیک ہوا۔

پہلا مزاحیہ مضمون

تعلیم تو اب گویا ختم ہو ہی چکی تھی کبھی کبھی ارادہ ہوتا تھا کہ پرائیویٹ طور پر کسی امتحان میں بیٹھ جائیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ ارادے بھی ختم ہو گئے۔ اور اب ہم بالکل ہمہ تن ممبر تھے۔ خالص انشاپرداز۔ اس زمانہ میں "رسالہ ترچھی نظر" جو امین سلونوی صاحب کی ادارت میں اگرچہ رسالہ نظر" بن چکا تھا۔ اور اس کا ترچھا پن نکالا جا چکا تھا۔ ہمارے افسانوں سے کسی ماہ خالی نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کیا سوجھی کہ ایک مزاحیہ مضمون "میٹھے چاول" کے نام سے لکھ دیا۔ یہاں عرض کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا اس مضمون سے پہلے ہم نے کوئی مزاحیہ مضمون دیکھا یا سنا بھی نہیں تھا۔ ظرافت بھی

لٹریچر اور فکاہی مضامین ہماری نظر سے اب تک نہیں گزرے تھے۔ اور ہم نے اپنے نزدیک یہ گویا لٹریری ایٹم مارا تھا۔ یہ مضمون عام طور پر بہت پسند کیا گیا۔ حالانکہ تھا بڑا عوام پسند قسم کا سطحی مضمون جس کو دیکھ کر اب بہت شرم آتی ہے۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم اسی طرز کے لیے اپنے قلم کو مخصوص کر لو۔ مگر ہم نے اس مزاحیہ مضمون کے بعد پھر بہت دنوں تک کوئی مزاحیہ چیز نہیں لکھی۔ البتہ سنجیدہ مضامین اور افسانے لکھتے رہے۔

رسالہ حُسنِ ادب

اب تک ہم صرف رسالہ زُہرِ نظر اور اس کے بعد اسی کی اصلاحی شکل رسالہ نظر سے واقف تھے۔ مگر ایک دن پاٹا نالہ کے بازار سے گزر رہے تھے۔ کہ ایک دھندلا سا سائن بورڈ نظر آیا۔ جس پر لکھا تھا "رسالہ حسنِ ادب لکھنؤ" اور سامنے ہی ایک صاحب بیٹھے تھے۔ گرتا اتارے، پاجامہ پہنے، سر منڈا ہوا۔ اور کانوں میں اکھاڑے کی لگی ہوئی مٹی، صورت دیکھ کر پتہ چل گیا کہ آدمی ہیں پہلوان قسم کے اور اس وقت غالباً اس رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کو ڈرا رہے ہیں یا کسی مضمون پر خفا ہو کر ان کو چپت کرنے تشریف لائے ہیں۔ ان سے دریافت کیا کہ کیا یہاں سے کوئی رسالہ نکلتا ہے۔ آپ نے فوراً چٹائی پر دو ہاتھ مار کر گرد اڑائی اور ارشاد فرمایا۔ تشریف رکھیے۔ ہم نے بیٹھ کر پھر وہی سوال کیا جواب

ملا۔ جی ہاں نکلتا ہے۔ مگر اس مرتبہ اس کے دو نمبر ساتھ ساتھ نکل رہے ہیں۔ تازہ پرچہ پچھلے مہینہ سے اب تک نہیں نکلا ہے۔ اس لیے پچھلے پرچے کو اور اس پرچہ کو ایک ساتھ ملا کر نکالا جا رہا ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ کون صاحب نکالتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کون ہیں۔ باقاعدہ دفتر کہاں ہے۔ ان تمام سوالوں کے جواب میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت خود ہی سب کچھ ہیں ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ۔

آپ خود ہی اس رسالہ کے مالک تھے۔ خود ہی مدیر تھے۔ خود ہی کاتب تھے خود ہی مصلح سنگ تھے۔ خود ہی پریس مین تھے۔ بلکہ صورت سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ خود ہی پریس بھی ہوں گے۔ مگر سامنے ہی ایک دستی پریس ان حضرت کا گرتا جیسے ٹھہرا تھا۔ اس وقت یہ حضرت اسی رسالہ کی کاپی بیٹھے لکھ رہے تھے۔ آپ نے بتایا کہ میں سب کام خود ہی کرتا ہوں۔ اور یہ رسالہ اپنے تمام مدارج میرے ہی ہاتھوں طے کرتا ہے۔ آپ نے رسالہ کا ایک گزشتہ پرچہ دکھایا جس پر ادارت میں سید محمود الحسن نقوی کا نام لکھا ہوا تھا۔ ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اب اس کی ادارت نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کچھ زیادہ اچھے آدمی ثابت نہیں ہوئے اور آپ نے یہ بھی بتایا کہ آپ ایک معقول قسم کے آدمی کی تلاش میں ہیں جس کا نام ادارت میں دیا جا سکے۔ اور جو رسالہ سے کچھ دلچسپی بھی لے سکے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں ایڈیٹر کو کسی قسم کا معاوضہ تو خیر نہیں دیتا۔ مگر ایڈیٹری

یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ کتنی عزت کی چیز ہے۔ ارے بھئی اس کو یوں سمجھئے کہ یہ گویا بڑی عزت کی چیز ہے۔ کیا نام کہ ایڈیٹر ہونا ہر ایک کو نصیب ہی کب آتا ہے۔" ہم نے کہا۔ "آپ بجا ارشاد فرماتے ہیں۔ بہر صورت آپ کا یہ تازہ پرچہ تو چھپ ہی رہا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی اور نمبر اس کا نکل سکا تو میں بھی اس کے لیے مضمون دوں گا۔" آپ نے فرمایا کہ "مضمون اگر آپ دیتے ہیں تو کیا نام کہ اسی رسالہ میں یعنی اسی نمبر میں نکل سکتا ہے۔ ابھی کافی جگہ ہے صرف ایک ہی مضمون میرے پاس ہے اور ایک غزل ہے اور نکالنا ہے دوہرا پرچہ کیا نام کو دو مہینوں کا گویا مشترکہ پرچہ۔" ہم نے ان سے اسی طرح دیر تک گفتگو کرنے کے بعد یہ وعدہ کر لیا کہ ایک سے زیادہ مضمون ان کو دے دیں گے اور اس وعدے کو دوسرے ہی دن وفا بھی کر دیا یعنی ایک افسانہ اور ایک مضمون جو غالباً برسات یا کالی رات یا صبح بنارس یا شام اودھ کے متعلق کچھ بکواس تھی دے دیا۔ ان مضامین کو دیکھ کر ان حضرت نے کچھ غور کرنا شروع کر دیا۔ ہم سمجھے کہ ان مضامین کو اپنے معیار پر جانچ رہے ہیں مگر قصّہ کچھ اور ہی تھا۔ چنانچہ ایکدم چونک کر فرمایا: "اور اگر میں آپ کا نام ایڈیٹری میں دے دوں۔" ہم کو اس کی امید بھی نہ تھی کہ ہمارے حصّہ میں یہ اعزاز آنے والا ہے۔ ہم نے کچھ دیر تامل کیا۔ غور کرتے رہے کہ یہ اعزاز قبول کرنا چاہیئے یا نہیں۔ آخر ہم نے ایک فیصلہ کن انداز کے ساتھ کہا۔ "بات یہ ہے واحد علی صاحب (یہ ان بزرگ کا

نام نامی تھا) کہ مجھے اس میں کوئی عذر تو نہیں ہے۔ مگر میں رسالہ کی موجودہ شکل بدلنے کا مطالبہ کروں گا۔ اس میں فی الحال بہت ہی لچر قسم کے مضامین نکل رہے ہیں" واحد علی صاحب نے جلیبی کھاتے ہوئے فرمایا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے کیا نام کہ آپ اس کو بہتر ہی تو بنائیں گے۔ اس میں میرا کیا نقصان ہے ارے بھئی یہ تو کیا نام کہ اپنے ہاتھ کی بات ہے ذرا ہاتھ سنبھال کر لکھ دیا کیجئے۔ کتابت میں مڑک ہی کچھ اور پیدا ہو جائے گی۔ ذرا احتیاط سے پتھر بنا دیا آئینہ ہو گیا۔" مختصر یہ کہ ہم نے ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ اور رسالہ کا دوسرا ہی روپ ہو گیا اب جو تازہ نمبر نکلتا ہے تو سرورق پر لکھا تھا۔ ایڈیٹر ملک التحریر شیخ محمد عمر شوکت تھانوی۔ یہ ملک التحریر اس لیے تھا کہ کسی رسالہ کے سرورق پہ ایڈیٹر کے بجائے "رئیس التحریر" ہماری نظر سے گذر چکا تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنے لیے ملک التحریر سے کم کوئی درجہ مناسب نہ سمجھا۔ منشی واحد علی صاحب اب بھی موجود ہیں اور اخبار سرپنچ کی کتابت فرماتے ہیں ان کا پرچہ اور پریس سب غالباً جلیبی والے کے نذر ہو گیا۔

رخصتی

۱۹۲۶ء کے اوائل ہی سے ہماری طرف سے یہ کوشش شروع ہو چکی تھی کہ کسی طرح رخصتی کی رسم پوری کر دی جائے اور ہماری سعیدہ ہمارے پاس آ جائیں۔ مگر ہمارے خسر صاحب کے حالات اجازت نہ دیتے تھے۔ کہ یہ

تقریب عمل میں آ گئے۔ والدہ صاحبہ سے خط لکھوائے۔ والد صاحب نے اصرار کیا اور جب سب کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تو مارے عقلمندی کے ہم نے نہ معلوم ان کو خط میں کیا لکھ دیا جس کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ اگر آپ کو رخصتی سے انکار ہے تو اب مجھ کو بھی اس رشتہ سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ٹھہرے عالم دین اس خط پر ان کو یہ شبہ ہو گیا کہ کہیں صاحبزادہ بلند اقبال نے اپنا پہلا ہی رنگ یہ دکھایا اب ان سے دریافت کر کے لکھا جائے کہ ان کا دراصل مدعا کیا ہے۔ تاکہ ان کے الفاظ واضح صورت میں میرے سامنے آئیں تو میں فیصلہ کروں کہ کہیں اس سے خدانخواستہ طلاق کا مفہوم تو پورا نہیں ہوتا ہے۔ والد صاحب نے یہ خط دیکھا اور ہم کو گھر سے نکل جانے کا نوٹس دے دیا۔ لیجئے چلے تھے گھر بسانے وہاں گھر اجڑنے کے سامان ہو گئے۔ آخر ہم نے پھر ایک نہایت مہذب قسم کا معذرت نامہ لکھا اپنے پچھلے خط کے الفاظ اس عمدگی سے واپس مانگے کہ خسر صاحب یہ خط پاکر باغ باغ ہو گئے اور گھر میں جا کر عورتوں سے کہا کہ صاحب یہ شخص قلم کا بادشاہ ہے ایک ہی خط میں میرے اس رنج اور غصہ کو کافور کر دیا جس کے متعلق میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میرا دل کیونکر صاف ہو گا۔ گویا پہلے خط سے ہم قلم کے غلام ثابت ہوئے تھے۔ اور دوسرے خط نے اسی خاندان غلاماں کو سریر آرائے سلطنت کر دیا۔ مگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ رخصتی کی تاریخ طے ہو گئی۔ اور دسمبر ۱۹۲۶ء میں ہم پھر ایک مرتبہ دولہا بن کر لکھنؤ سے بین پوری گئے

والد صاحب قبلہ پہلے ہی سے مین پوری کی نمائش میں خان بہادر سید زین الدین کلکٹر مین پوری کی دعوت پر تشریف لے جا چکے تھے۔ آپ نے تار پر اطلاع دی کہ تم لوگ آ جاؤ میں یہیں بارات میں شامل ہو جاؤں گا۔ لہذا ماموں صاحب ہم کو اور ہمارے ایک دوست کو لے کر مین پوری روانہ ہو گئے۔ یہ گویا تین آدمیوں کی بارات تھی اور چوتھے باراتی مین پوری ہی میں موجود تھے۔ نہایت سادگی کے ساتھ رخصتی عمل میں آئی۔ کسی قسم کی کوئی رسم ادا نہیں کی گئی۔ مختصر یہ کہ سلام کرائی ہوئی اور جو تھوڑا بہت روپیہ اس سلسلہ میں ملا۔ وہ ماموں صاحب کے حوالے کر کے ہم اپنی سعیدہ کو لکھنؤ لے آئے۔ یہاں البتہ مہمان بھی کافی تھے۔ اور گھر میں شادی کی چہل پہل بھی نظر آ رہی تھی۔

دو رسمیں

ہر چند کہ شادی کے سلسلہ کی تمام رسموں کے لیے والد صاحب نے بھی منع کر دیا تھا۔ اور ہم بھی ان رسموں سے بالکل متفق نہ تھے۔ بلکہ رسموں کے بائیکاٹ کا اعلان کر چکے تھے۔ مگر پھر بھی دو رسمیں ہو کر ہی رہیں۔ پہلی رسم یہ کہ دولہن کے دامن پر کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ گویا نماز پڑھوائی جائے تو وہ بھی دلہن کو جا نماز بنا کر عبادت کی جائے۔ مگر شرک کی آغوش میں۔ مگر اب ان بڑی بوڑھیوں سے کس کا بس چل سکتا تھا۔ کھڑے ہو کر نیت باندھی کہ نیت کرتا ہوں میں دو رکعت نماز کی جس کی ذمہ داری اس گھر کی بڑی بوڑھیوں کے سر ہے۔ وقت جو نماز

سے ہر وقت سے الگ ہے۔ منہ میرا طرف بیوی سے اللہ معاف کرے۔!
اور اس کے بعد نہ جانے کیا زیرِ لب بڑبڑاتے رہے۔ اور اسی طرح یہ نماز ختم ہو گئی۔ دوسری رسم کھیر چٹائی کی تھی۔ کہ دلہن کو کھیر چٹاؤ اور اس کے ہاتھ سے کھیر چاٹو۔ اس رسم سے بھی کسی نہ کسی طرح جان چھوٹی۔ وہ تو کہیے کہ ان دونوں رسموں کے بعد دولہا میاں بھاگے سر پر پیر رکھ کر۔ ورنہ یہ عورتیں تو اس وقت تک دم ہی نہیں لیتیں جب تک کہ دولہا کی سات پشتوں کو احمق بنا کر نہ رکھ دیں ان کے نزدیک تو سب سے زیادہ کامیاب دولہا وہی ہوتا ہے۔ جو سب سے زیادہ چغد ثابت ہو۔ معلوم یہ ہوا کہ وہاں آرسی مصحف کے انتظامات بھی تھے مگر خدا نے ہم کو بال بال بچا دیا۔

دلہن کی نماز

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہماری خالہ اماں بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب نے ہم کو بلا کر مبارکباد دی کہ بھیا میں تو مبارکباد اس بات کی دیتی ہوں کہ دلہن اللہ رکھے ہے پکی نمازن، اس نے اپنے دلہناپے کی پرواہ بھی نہیں کی اور چادر تو اگر اسی دلہناپے میں تمام وقتوں کی نماز پابندی سے پڑھ چکی ہے۔ ہم ان کے سامنے تو مسکرا کر رہ گئے مگر دل میں ایک تشویش یہ پیدا ہو گئی کہ

مجھے لگا کس طرح سے اس پری پیکر سے یارانہ
کہ وہ اتنی نمازن اور یہ گھر پورا بُت خانہ

چنانچہ یہ تشویش بعد میں صحیح بھی ثابت ہوئی اس لیے کہ شادی کے بعد سے اب تک اس سلسلہ میں ایک کشمکش جاری ہے نہ وہ ہم کو نماز پڑھوا سکیں نہ ہم ان کی نماز چھڑا سکے۔ وہ تو خیر بلاوجہ نماز نہیں چھوڑ رہی ہیں۔ مگر ہمارے پاس نماز نہ پڑھنے کا ایک بہت بڑا عذر موجود ہے کہ اب اگر ہم نے نماز پڑھی تو خدا ہم سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ اے بندے تو نے ہمارے کہنے سے تو نماز پڑھی نہیں۔ اب بیوی کے کہنے سے کیوں پڑھ رہا ہے۔ اور اس حالت میں یہ نماز ہمارے لیے ہوئی یا تو اپنی بیوی کے لیے پڑھتا ہے؟ ان حالات کے ماتحت انتظار ہے اس وقت کا جب خدا بیوی کو یہ توفیق دے کہ وہ نماز کے لیے کہنا چھوڑ دیں۔ اور ہم کو یہ توفیق عطا کرے کہ ہم جسکی نماز ہے اُسی کیلئے پڑھیں۔

سعیدہ سے ملاقات

دن بھر کے انتظار کے بعد رات آئی۔ اور رات آدھی گذر گئی تو اندر سے طلبی ہوئی۔ اور ہم دھڑکتے ہوئے دل اور سنسناتے ہوئے ہاتھ پیر کے ساتھ ڈگمگاتے ہوئے اندر پہنچے۔ سب سے پہلے والدہ صاحبہ نے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا کیا خوبصورت وعادی ہے کہ جاؤ میاں خدا کرے اس کی اپڑی دیکھ کر کسی

اور کی صورت نہ دیکھو۔" شاعر کا مطلب اس شعر سے خواہ کچھ بھی ہو۔ مگر ہم کورچشمی کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ماں کی بد دعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے چنانچہ ان کی اپڑی دیکھ کر آج بھی اچھی صورت پر بُری نظر پڑ ہی جاتی ہے والدہ صاحبہ نے ایک اور عزیزہ کو اشارہ کیا اور وہ ہم کو حجلہ عروسی میں لے جاکر چھوڑ آئیں۔ جہاں ہماری سعیدہ ایک لال رنگ کی گٹھڑی بنی بیٹھی تھیں اور ہماری نگاہوں میں ان کا وہی ملکوتی تاب چہرہ گھوم رہا تھا جب وہ بچن پوری میں ہم سے کہہ رہی تھیں کہ اپنی شادی میں ہم لوگوں کو بھلا کیوں بلانے لگے۔ ان بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ یہ شخص اپنی شادی میں صرف ان ہی کو بلائے گا۔ تنہائی ہوتے ہی ہم نے سعیدہ سے کہا کہ سنئے جناب اب اپنی گردن سیدھی کیجئے اور یہ چوچلے چھوڑ کر آدمیت کے جامہ میں آجایئے۔ مگر وہ بھلا کب سننے والی تھیں۔ آخر ہم نے خود ان کی گردن سیدھی کر دی۔ اور ایک لکچر دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ یہ شرم و حیا ایک حد کے بعد جہالت کی نشانی بن جاتی ہے۔ آپ ماشاء اللہ پڑھی لکھی سمجھ دار ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں کی باہمی زندگی کا یہ پہلا دن یا پہلی رات ہے اگر اس زندگی کی ابتدا ان چوچلوں اور اس جہالت سے ہوئی تو اللہ حافظ ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلے آپ سے مصافحہ کروں۔ شرعی طور پر دو سال قبل آپ اپنے کو میرے حوالے کر چکی ہیں۔ اور آج اپنا ہاتھ بڑھا کر اس قول کی تصدیق کر دیجئے۔ ہمارا لکچر ختم ہو گیا۔ مگر وہاں سے

کرائی رسید نہ آئی۔ اور ہم دیر تک ہاتھ بڑھائے کھڑے رہے۔ آخر ہم نے اڈ زیادہ متاثر کرنے والے الفاظ ڈھونڈ کر تقریر کی کہ دیکھئے یہی وقت ہے۔ جو ہم دونوں کی زندگی بنانے یا بگاڑنے کا فیصلہ کرے گا۔ اس امتحان کے وقت آپ کا اس طرح خاموش رہنا کوئی خوشگوار نتائج مشکل سے پیدا کرے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ اپنا مستقبل کچھ خوشگوار بنیادوں پر ہم دونوں تعمیر کریں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ خدانخواستہ بہری نہیں ہیں۔ میرے الفاظ سُن رہی ہوں گی۔ گونگی بھی نہیں میری بات کا جواب دے سکتی ہیں۔ لہٰذا اب آپ منہ سے بولیے سر سے کھیلئے اور سب سے پہلے اپنا یہ ململ گھونگھٹ اُلٹ دیجئے۔ جس سے مجھے اختلاج ہو رہا ہے پھر جواب ندارد اور حالات حسب معمول۔ مجبوراً ہم نے خود گھونگھٹ اُلٹ دیا اور ان سے استدعا کی کہ خدا کے واسطے اپنی ناک سے یہ نتھ اتار دیجئے جسے دیکھ کر یا تو میں بھاگ جاؤں گا۔ ورنہ بہیں گر پڑوں گا۔ اور اگر اس سلسلہ میں بھی آپ نے میری شنوائی نہ کی۔ تو میں آپ کو مزید زحمت دیئے بغیر یہاں سے دفعان ہو جاؤں گا۔ شکر ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری درخواست فوراً منظور ہو گئی۔ اور نتھ جلدی سے اتار دی گئی۔ اب گویا حالات امید افزا تھے۔ لہٰذا ہم نے موقع غنیمت جان کر کہا "شاباش۔ دل خوش ہو گیا۔ اب البتہ انسانوں کی سی صورت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے تو نتھ پہن کر آپ دنیا کا نقشہ نظر آ رہی تھیں۔ اچھا اب مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائیے۔ بڑھایئے جلدی ہاتھ ایک دو تین چار پانچ

دس تک گنتا ہوں۔ اس عرصہ میں آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ ایک دو۔ تین چار۔ پانچ چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ اور۔ اور۔ اور۔ اور اچھا تو خدا حافظ ہم اُٹھنے ہی والے تھے کہ وہاں ایک جنبش ہوئی۔ اور ہم نے پھر کہا۔ جی ہاں آٹھ۔ نو۔ اور "ایک خفیف سی جنبش کے بعد ہاتھ آگے بڑھا دیا گیا۔ اب ہم نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔" واقعی سعیدہ تم میری توقع کے بالکل خلاف ثابت ہو رہی ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ تم عام دلہنوں سے مختلف ایک سمجھدار دلہن ثابت ہوگی۔ اور ان دقیانوسی ڈھکوسلوں کی ہرگز قائل نہ ہوگی۔ آخر یہ کیا واہیات ہے۔ اچھا بتاؤ تم میری کون ہو —— بولو —— ادھر دیکھو۔ منہ اٹھاؤ اور دیکھ کر بتاؤ۔ تم میری کون ہو۔" منہ تو خیر نہیں اٹھایا۔ مگر ایک نہایت باریک مگر کھنکتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔ "کنیز" ہم ایک دم اچھل پڑے کہ ارے واہ ری میری بیوی کوئی اور عورت ہوتی تو لونڈی کہتی۔ اس موقع پر مگر کنیز یہ علامت ہے پڑھی لکھی ہونے کی۔ لونڈی کا لفظ سن کر جو تخیل دماغ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک میلی کچیلی، کالی کلوٹی ہوڑی سی ناک اور نیلے ہونٹوں والی لونڈیا سامنے کھڑی اپنے جھونٹے نوچنے کے انداز سے کھجا رہی ہے۔ اور اس کی چندھی چندھی آنکھوں میں کیچڑ بھی بھری ہے۔ مگر کنیز سن کر ایک دوسری تصویر سامنے آتی ہے کہ گویا مصر کے کسی بازار میں کھڑے ہیں اور وہاں ایک دھان پان نازک سے نقشہ والی گوری چٹی۔ سادہ لباس پہنے معصوم سی کنیز ہمارے سامنے

موجود ہے۔ جو ہمارے احکامات کی منتظر ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ یہ ہم کو خود
کوئی حکم دے۔ اور ہم اس کی تعمیل کریں۔ بہر صورت اس وقت سعیدہ کی زبان
سے کچھ سن کر ہم نے ان کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اور اب تک جتنی انسانیت
اور شرافت برتی تھی۔ اس سب کی تلافی کر دی۔ نتیجہ یہ کہ ابھی اندھیرا ہی تھا۔ اور کچھ
خفیف سی بارش بھی ہو رہی تھی کہ سعیدہ نے ہم کو کمرہ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا
اور باہر نکل کر ہم نے دیکھا تو واقعی ابھی کافی دیر تھی دن نکلنے میں۔ چوروں کی طرح زنانہ
حصہ سے نکل کر مردانہ نشست میں آئے اور اپنے ایک عزیز کے بستر میں
گھسے ہی تھے کہ وہ حضرت نہ جانے کیا سمجھ کر چیخ اٹھے۔ اور سونے والوں میں
سے کم سے کم آدھے لوگوں کو تو ان حضرت نے جگا کر یہ خبر کہہ ہی دی کہ ہم باہر
آگئے ہیں۔ اسی دن دعوت ولیمہ تھی۔ مگر شکر ہے چوتھی چالے وغیرہ سے ہم کو
واسطہ نہ پڑا۔

شوہرانہ ٹھاٹھ

اب ہم خود اپنی نظروں میں کچھ وقیع کچھ بھاری بھرکم اور کچھ ذمہ دار سے معلوم ہونے لگے
تھے۔ حالانکہ غیر ذمہ داریوں کا عالم یہ تھا کہ بیوی گھر میں آ چکی تھی۔ اور ہم محض رئیس بنے
نہ کمانے کی فکر۔ نہ کچھ تدبیر مستقبل۔ تعلیم چھوٹ ہی چکی تھی۔ گھر کی خبر بھی ہم کو نہ تھی۔ نہ معلوم
نہیں خرچ کیونکر چلتا ہے۔ اور اچھی خاصی شاہانہ زندگی بسر ہوتی ہے۔ جو دیکھتا
ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ کھاتا پیتا گھرانہ ہے۔ مگر گھر میں بس اللہ کا نام ہی تھا۔ والد

صاحب کی معمولی پنشن کے علاوہ اور کوئی خاص آمدنی نہ تھی جو روپیہ جمع تھا وہ بھی خرچ ہو چکا تھا۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی ہمارے ذہن میں نہ آسکی ہم تو پورے شہزادہ ٹھاٹھ میں تھے۔ کہ ایک علیحدہ سجا ہوا کمرہ ہم کو مل گیا تھا جس میں معطر معطر ایک دلہن شام کو پھولوں سے لدی اور دن کو بھیگے بال پشت پر کھولے ہوئے ہم کو ملا کرتی تھی۔ ہم سو جاتے تھے تو وہ ہماری پنکھا جھلا کرتی تھی ہم کو خوش کرنے کے لیے وہ ہماری مہمل سے مہمل بات پر بھی ہنستی تھی گویا ہم واقعی بہت بذلہ سنج اور بڑی خوشگوار گفتگو کرنے والے تھے۔ ہم اس کو اپنے مہمل شعر سنایا کرتے تھے اور وہ آنکھوں کو وجد میں لاتی تھی۔ اپنے سجے ہوئے پاندان سے گلوریوں پر گلوریاں ہم کو دیتی تھی۔ یہ باتیں ہر بیوی کرتی ہوگی۔ مگر ہمارے لیے یہ باتیں بہت ہی مفرح ثابت ہو رہی تھیں۔ اکثر ہم اپنے اس اقتدار کا مظاہرہ احباب پر جتانے کے لیے بھی کرتے تھے کہ گھر میں بیوی سے کہہ گئے کہ میں رسالہ نظر کے دفتر جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں وہاں سے چائے منگاؤں گا تم ذرا اہتمام کے ساتھ بھیج دینا رسالہ نظر کے دفتر میں پہنچے۔ ایمن سلونوی صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے بیوی کی قابلیت کے قصیدے پڑھے اور آخر چلنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا کہ بھئی اب میری چائے کا وقت آگیا ہے تم کو چلنا ہو تو چلو میرے ساتھ یا اگر کوئی آدمی گھر تک بھیج سکو تو یہیں چائے منگا لوں۔ ایمن صاحب نے فوراً اپنا آدمی بھیج دیا تو گھر سے نہایت پرتکلف چائے بغیر کسی انتظار کے آگئی۔ ایمن صاحب حیران

کہ بھئی یہ تو پوری ٹی پارٹی کا سامان ہے۔ اور ہم گویا بے پروائی سے کہہ رہے ہیں
کہ ہاں جی تو میں کہتا ہوں کہ بیوی ہو تو کم سے کم ایسی تو ہو۔ بھئی میں تم سے کیا کہوں حال
یہ ہے کہ صبح میں غسل کرنے کے لیے جاتا ہوں تو فوراً سوال ہوتا ہے کہ آج آپ
کون سا سوپ استعمال کریں گے۔ موسم تو سرس کا ہے یا پھر کیٹیکورا استعمال کیجیے
غسل خانہ میں پہنچے تو وہاں ہر چیز سلیقہ سے موجود۔ کپڑے الگ ٹنگے ہیں۔ تولیہ
الگ اسٹینڈ پر موجود۔ پانی کا ٹمپریچر وہ خود دیکھتی ہیں۔ میں کہتا بھی ہوں کہ آخر اس
کی کیا ضرورت ہے۔ تھوڑا سا گرم یا تھوڑا سا ٹھنڈا ہو جائے گا تو کیا مضائقہ ہے
مگر وہ ان باتوں کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ جب دیکھو یہ معمولی سی بات ہے کہ یہ جو
ٹی کوزی ہے یہ خود ان ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ امین مرعوب ہو کر کہتے: اچھا۔ ارے
بھئی یہ تو بڑی لاجواب ہے۔ ایسی تو بھابی سے ایک مجھے بھی بنوا دو۔ چنانچہ دوسرے
ہی دن پھر ایک ٹی کوزی حضرت گنج سے جاکر ایک خوبصورت سی لے آتے اور امین
کو دے دیتے کہ یہ لیجیے میں نے جو جاکر سرکار سے عرض کیا کہ امین کو تمہاری
بنائی ہوئی ٹی کوزی بہت پسند آئی ہے۔ تو پہلے تو ایک ادائے خاص کے ساتھ
جھک کر سلام کیا۔ کہ میں کس قابل ہوں۔ یہ سب فیضِ صحبت ہے۔ پھر جب میں
نے کہا کہ امین نے بھی ایسی ہی ٹی کوزی کی فرمائش کی ہے تو ٹھنک کر کہنے لگیں
کہ اللہ اس میں ایسے کون سے لعل جڑے ہوئے ہیں۔ یہ تو بالکل ہی معمولی سی بنا
دی تھی۔ میں ابھی امین کے لیے بنائے دیتی ہوں۔ چنانچہ ٹھنڈی ہی رات میں یہ

لی کو زی تیار کر کے دے دی۔ اب ایلین کا تعقا و ظاہر ہے کہ کس قدر پختہ ہو گیا ہو گا اسی طرح کسی دوست کو بیوی کا کلام سنا رہے ہیں۔ کسی کو بیوی کے افسانے سنا رہے ہیں۔ کسی کو چاکلیٹ کھلا رہے ہیں کہ یہ گھر ہی کا بنا ہوا ہے۔ تمہاری بھابی نے بنایا تھا۔ اور جب وہ میکے چلی گئیں، تو ہمارے تمام دوستوں کو یہ خبر تھی۔ کہ آل انڈیا لیڈیز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہمارے تمام دوست اپنی اپنی بیویوں سے نہ صرف بد عقیدہ ہو گئے۔ بلکہ ہم پر رشک بھی کرنے لگے کہ اس کمبخت کو دیکھو کیسی لاجواب بیوی پائی ہے جو ہر فن مولا ہے۔ ممکن ہے یہ بات عرض کرنا بھول جائیں کہ سعید اب شوکت دلہن کے نام سے رسائل میں بھی چھپنے لگی تھیں۔

بیوی کی تصویر

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ہم کو راستہ میں ایک لفافہ پڑا ہوا ملا کھول کر دیکھا تو اس میں ایک تصویر تھی۔ نہایت خوبصورت اور بالوں کے انداز اور لباس کی ترتیب سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی تعلیم یافتہ لڑکی کی تصویر ہے۔ اس تصویر کو ہم نے اپنے پرس میں رکھ لیا اور اب جو احباب کے سامنے پرس کھولتے ہیں۔ تو تصویر سامنے ہی تھی یہ سب کے سب "شیطان" "بیوی کی تصویر۔ بیوی کی تصویر" کہہ کر لپکے ہماری طرف اور ہم نے تصویر کو چھپانے کی بظاہر بہت کوشش کی۔ آخر ان حضرات نے تصویر

چھین کر خوب خوب دیکھی مختلف ریمارکس پاس ہوئے۔ کسی نے کہا کہ یار ایسی بیوی پاکر تو کبھی خود بھی آئینہ دیکھتا ہے کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ ایک صاحب نے رائے دی۔ کہ میاں تم ایک ماہر نقال ہو بیوی کو لے کر اگر بمبئی چلے جاؤ تو کسی فلم کے لیے تم اور وہ دونوں معقول معاوضہ پر رکھ لیے جاؤ گے۔ مختصر یہ کہ وہاں تو سب کو یقین کہ یہ بیوی کی تصویر ہے۔ اور ہم نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار بلکہ اس طرح چپ ہیں کہ گویا اب تو تم لوگوں نے تصویر دیکھ ہی لی۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جب ہم لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو سراج احمد صاحب ہمارے ساتھ ہو لیے کہ تم سے ایک کام ہے۔ اور جب دور نکل آئے۔ تو ادھر ادھر دیکھ کر کہا یہ تصویر کہاں ملی تھی تم کو۔

ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟"

کہنے لگے۔ "یوں ہی پوچھتا ہوں۔"

ہم نے بتا دیا۔ "الیاس کے مکان کے سامنے یہ لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اٹھا لیا۔"

کہنے لگے۔ "کمال ہو گیا۔ میری کتاب سے نہ جانے کس طرح نکل گیا۔ بھابی جان کی تصویر ہے۔ اور آپ نے سب سے کہہ دیا کہ میری بیوی کی تصویر ہے۔ سبحان اللہ لائیے تصویر مجھے دیجئے۔"

ہم نے تصویر دیتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر آپ الزام لگا رہے ہیں۔ یہ کس نے

پر کب کہا کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے۔ بلکہ میں تو اسی لیے تصویر چھپا رہا تھا۔ یہ تو ان ہی لوگوں نے کہا کہ یہ میری بیوی کی تصویر ہے۔ اور آپ وہاں کیوں خاموش تھے

سراج نے کہا: "ماشاءاللہ تو گویا میں سب سے یہ کہہ دیتا کہ بھابی جان کی تصویر ہے تاکہ سب پھر مذاق اڑاتے۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا ہو گیا مگر اب آپ لطیفہ کے طور پر یہ قصہ نہ سنا بیٹھیے گا کہیں۔"

ہم نے وعدہ کر لیا کہ کسی سے نہ کہیں گے۔ چنانچہ اس وقت تک لکھنے سے تھا وہ آج تک کسی سے نہیں کہا اور اب لکھنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے اس لیے کہ سراج کی بھابی جان نے اب پردہ بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اور سعیدہ بھی بے پردہ ہو چکی ہیں۔ اب سب کو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ تصویر کس کی تھی ہماری بیوی کی یا سراج کی بھابی جان کی۔

مولانا آسی

اسی زمانہ میں امین سلونوی صاحب نے ہم کو ایک شعر سنایا ؎

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا۔

معلوم نہیں اس شعر میں وہ کون سی بات ہے کہ آج بھی اسے یاد کر کے تقریباً وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو اس شعر کو پہلی مرتبہ سُن کر طاری ہو گئی

تھی۔ بار بار ہم نے اِس شعر کو سُنا اور بار بار امین صاحب نے سُنایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ یہ شعر مولانا عبدالباری آسی کا ہے۔ جن کے متعلق امین صاحب ہم کو کئی بار یہ مشورہ دے چکے تھے کہ اگر تم شعر کہتے ہو تو کسی کو دکھا بھی لیا کرو۔ اور سب سے اچھا یہ ہو کہ مولانا آسی سے مشورہ لے لیا کرو۔ اب تک تو خیر ہم ٹال جاتے تھے۔ مگر آج یہ شعر سُن کر ہم نے امین صاحب سے عرض کیا کہ ہم کو مولانا آسی کے پاس لے چلو۔ مولانا آسی سے اپنی اِس ملاقات کا ذکر ہم نے "شششن محل" جلد اوّل میں کیا ہے۔ مگر یہاں بھی اُسی کی کچھ تکرار ہو رہی ہے۔ امین صاحب کے ساتھ ہم مولانا آسی کے در دولت پر حاضر ہُوئے۔ کبوتروں کی ڈھابلیوں سے لبریز صحن کو عبور کر کے ہم لوگ ایک دالان میں پہنچے۔ جہاں ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ ایک نہایت ضعیف العمر بیاھی کے ساتھ بیٹھے شطرنج میں مشغول تھے۔ امین صاحب نے جاتے ہی کہا۔ "السلام علیکم مولانا"

مولانا نے فرمایا۔ "تھوڑا ٹھیریئے یار رُخ۔ وعلیکم السلام تشریف رکھیے"

اور تھوڑی ہی دیر کے بعد مولانا بازی جیت گئے۔ تو امین صاحب نے تعارف کی رسم ادا کی۔ اور ہم نے تعارف کے بعد مولانا سے اُن کے اُسی شعر کے متعلق عرض کیا کہ مجھ پر آج تک کسی شعر کا کبھی اتنا اثر نہیں ہُوا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا مکمل شعر آج میں نے سُنا ہے۔ مولانا اِس سلسلہ میں مسکرا کر خاموش ہو رہے اور جب امین سلونوی صاحب نے ہم کو مولانا کی شاگردی میں پیش کیا تو

تو مولانا نے ازرہِ شفقت ہم کو قبول کر لیا۔

مولانا آسی کی علمی قابلیت اور شاعرانہ صلاحیت ہم پر روز بروز واضح ہوتی گئی۔ اور آج بھی اس سلسلہ میں ہم مطمئن ہیں کہ ہمارا استاد واقعی اپنے فن کا ایک مشاق فن کار ہے۔ اور اس کا شاعرانہ مرتبہ یقیناً بہت بلند ہے۔ مولانا آسی کے مشورے نے تھوڑے ہی دنوں میں شعر کہنے سمجھ کر کہنے اور کہہ کر سنانے کے قابل بنا دیا۔ اب تک ہم شعر تو کہا کرتے تھے مگر نہ جانے کہا کرتے تھے یا بکا کرتے تھے۔ مگر اب باقاعدہ شعر گوئی شروع کر دی۔ اور مشاعروں میں پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں تک اپنے استاد کے بل بوتے پر شاعر بنے رہے۔ آخر خود رینگنا پھر چلنا اور اس کے بعد دوڑنا شروع کر دیا۔ اب بھی مولانا آسی اتنی نگرانی ضرور رکھتے ہیں کہ کہیں ان کا پڑھایا ہوا ٹھوکر نہ کھائے تفصیلی طور پر مولانا آسی کا ذکر شمیشِ محل میں آ چکا ہے۔ اور یہاں چونکہ تفصیل کی گنجائش نہیں لہٰذا یہی اجمال کافی ہوگا

مشاعرے

مولانا آسی سے مشورہ سخن لینے کا سب سے پہلا نتیجہ تو یہ نکلا اب مشاعروں کی شرکت باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دی۔ لکھنؤ میں مشاعروں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔ سوائے محرم کے یہاں مشاعرے بے قید موسم ہمیشہ ہوا ہی کرتے ہیں شاذ ہی کوئی منحوس دن ایسا گذرتا ہو جب شہر میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی بڑی بزم

سخن گرم نہ ہوتی ہو۔ اور مولانا کا مشورہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مشاعروں میں شرکت کرو چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ہم نے بے شمار مشاعرے پڑھ ڈالے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مشاعرہ باز حضرات ہمارے پاس شرکت کے دعوے لیئے ہر طرف سے آنے لگے آواز اچھی تھی۔ پڑھنے کا طریقہ دلنشین تھا۔ لہٰذا مشاعروں میں خوب خوب اچھلے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی اُچھلنے کے لیے اپنی غزلیں ہم سے پڑھوانا شروع کر دیں۔ مثلاً وصل بلگرامی صاحب نے تو ہم کو اپنا مستقل گراموفون ہی بنالیا تھا۔ کہ ہم سے ہر مشاعرے میں غزل پڑھواتے تھے اور خود سلام کرتے تھے۔ دراصل ہم نے سب سے پہلے جس مشاعرے میں شرکت کی ہے وہ انجمن معین الادب لکھنؤ کا مشاعرہ منجانب وصل بلگرامی تھا۔ اور طرح تھی

ع پردہ جو اٹھاتا ہوں پردہ نظر آتا ہے

وصل صاحب نے اسی مشاعرے میں اپنی غزلیں پڑھوانے کے لیے گویا اس خاکسار کا انتخاب کر لیا تھا۔ اور آخر میں تو اللہ بخشے مرحوم ایک مستقل عذاب بن کر رہ گئے تھے۔ اکثر مشاعروں میں یہ بھی ہوا کہ ہم نے اپنی غزل پڑھی۔ وہ ایک اور غزلیں پڑھیں اور پھر وصل صاحب کا دو غزلہ سہ غزلہ۔ وہ کبھی کسی غزل میں پچیس تیس شعر سے کم نہیں کہتے تھے۔ اور ہر شعر کے متعلق سامعین سے ان کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ بار بار پڑھوانے پر اصرار کریں۔ چنانچہ وہ ہمارے پاس بیٹھ کر سلام کرتے جاتے تھے۔ اور چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔ "پھر پڑھو۔ پھر پڑھو۔" بات یہ

تھی کہ وہ خود غزل میں ڈوبیں یا نہ ڈوبیں مگر ہمارا بیڑہ غرق کرنے کی قسم کھا چکے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ خود وصل صاحب کو اپنا کلام خود بھی پڑھنا پڑا۔ اور اس کیفیت کو ہم کبھی الفاظ میں بیان ہی نہ کر سکے جو وصل صاحب کے خود پڑھنے سے پیدا ہوتی تھی کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا تین چار پاگل گتھے لڑ رہے ہیں۔ یا منڈی کے کنجڑوں میں کسی بات پر تکرار ہو گئی ہے یا پاگل خانہ کے کسی کمرے میں کچھ پاگل آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ غزل پڑھتے وقت ان کے گلے کی رگیں پھول جاتی تھیں۔ آنکھیں خون برساتی تھیں۔ منہ سے جھاگ اڑتا تھا آواز میں کچھ بم۔ کچھ ٹینک کی گھڑگھڑاہٹ کچھ ریڈیو کی فضائی خرابیاں۔ کچھ رعد کی کیفیتیں سب مل جل کر وہ بات پیدا کر دیتی تھیں جس کو سوائے عذاب الٰہی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سامعین اس غزل کو سن کر تھوڑی دیر تک خدا سے اپنے گناہوں کی توبہ کرنے کے بعد اس قابل ہو سکتے تھے کہ کسی اور کا کلام بھی سنیں اور سمجھیں۔ ڈر کے مارے داد تو سب ہی کو دینا پڑتی تھی۔ مگر وصل صاحب کی غزل سرائی بھی دنیا کی کسی بیداد سے کم نہ تھی۔ غالباً وہ خود اس ادبی ورزش سے تنگ تھے اور واقعی ان کا غزل پڑھنا پوری غزل کی وفات ہوتی تھی۔ یا تو اس تکلیف سے بچنے کیلئے یا اپنی غزل کی خوفناکیت کو کم کرنے کے لیے یعنی سامعین کو ڈرا دھمکا کر داد لینے کے بجائے وہ یہ چاہتے ہوں گے۔ کہ غزل موسیقی سے سُنی جائے۔ اور لوگ اس پر خوش ہو کر داد دیں۔ کچھ بھی ہو وصل صاحب کے اس عمل نے ہم کو مشاعروں سے بیزار کر دیا تھا۔ کہ آخر لوگ کیا سمجھتے ہوں گے

کہ وصل صاحب اپنا تو مدگر ساتھ رکھتے ہیں۔ لاکھ لاکھ بچنے کی کوششیں کرتے،
مشاعروں سے بھاگتے۔ وصل صاحب سے منہ چھپاتے۔ مگر توبہ کیجیے۔ وصل صاحب
کے کاٹے کا منتر ہی نہ تھا وہ غزل پڑھنے کا حکم دے دیتے تھے۔ اور ہم تعمیل کے
لیے گویا مجبور تھے۔

مین پوری کے مشاعرے

ہمارے خسر محترم مولوی سجاد حسین صاحب قبلہ نے اپنے داماد کو بحیثیت شاعر
کے اہلِ مین پوری کے سامنے پیش کرنے کے خیال سے پہلے وہاں کی مقررہ
طرحوں پر ہم سے غزلیں منگائیں۔ اس کے بعد ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے
خود ہم کو طلب کر لیا۔ اسی مشاعرے میں سب سے پہلے حضرت جگر مراد آبادی اور
جناب فانی بدایونی سے ملاقات ہوئی۔ جگر صاحب بہت ہی خلوص و محبت کے
ساتھ ملے۔ اور پھر جب تک ہم مین پوری میں رہے جگر صاحب کا ساتھ نہ
چھوٹا۔ فانی صاحب دوسرے ہی دن آگرہ چلے گئے۔ مگر اسی مختصر ملاقات میں بہت
ہی خصوصی تعلقات ان سے بھی قائم ہو گئے۔ مین پوری کے مشاعرے میں دو
انمول جواہر اور بھی ملے یعنی بھائی چھراں صاحب صادق اور ترنگی عمران شاہ وصالی
دونوں سے آج تک برادرانہ تعلقات ہیں۔ آج کل یہ حضرات بھوپال میں
اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اور حال یہ ہے ان دونوں کا کہ بھوپال جاکر ہم اپنے
بھائی جان ارشد تھانوی صاحب کے یہاں اس لیے نہیں ٹھہر سکتے کہ وہاں

بہادری چیرمین صادق اور ترمبنی سرن شاد بھی رہتے ہیں۔ مین پوری کے ان مشاعروں میں مولوی سجاد حسین صاحب قبلہ خود ہم کو لے کر جاتے تھے۔ وہ مشاعرے کی صدارت کرتے تھے۔ اور ان کے زیر صدارت جس وقت ہم غزل پڑھتے تھے۔ اس وقت ان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ گویا ان ہی کا کلام پڑھا جا رہا ہے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ ہمارے کسی شعر پر سامعین کی داد سن کر سلام کرنے لگیں کہ آداب عرض یہ اسی خاکسار کا عزیز ہے۔

پہاڑ پھٹ پڑا

ہم ان ہی رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ آج بنارس کا مشاعرہ ہے، تو کل گورکھپور کا مشاعرہ آج بہار اردو کانفرنس ہے تو کل وہ منظمہ آج یہاں نظم پڑھنا ہے تو کل وہاں پیر سننا ہے کہ یکایک والد صاحب پھر بیمار پڑے پھوڑا پیٹ میں ہوا میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور وہاں جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو گھر ہی پر کیپٹن نگم سے آپریشن کرایا۔ مگر مرض کسی طرح قابو میں نہ آسکا ایک شکایت دور ہو جاتی تھی۔ اور دو تین شکایتیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر محمد عمر صاحب ہمارے خالہ زاد بھائی اور مولوی سجاد حسین صاحب کے برادر عزیز لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے۔ غالباً پوسٹ گریجویٹ کورس کے لیے۔ آپ نے والد صاحب کا معائنہ کر کے بتا دیا تھا۔ کہ اب ان کا جانبر ہونا مشکل ہے۔ پیشاب میں گردوں

سے بیمار بی اس قدر نکل چکی ہے۔ کہ اب کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ہر ممکن طریقہ پر بہتر سے بہتر علاج ہوا۔ دن میں چار چار اور پانچ پانچ ڈاکٹر آئے ایک مرتبہ چھ ڈاکٹروں نے ایک ہی وقت میں دیکھ کر باہمی مشورہ سے علاج کیا۔ مگر وقت آچکا تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو رائے بہادر رگھنو بیر بہادر شاہ اور حکیم خواجہ کمال الدین صاحب آپ کو دیکھنے کے لیے آئے تو آپ بہت بشاش تھے۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ اور آخر میں آپ نے رائے بہادر صاحب سے کہا۔ کہ ان لوگوں نے معلوم کیا ہو گیا ہے۔ یہاں چل چلاؤ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا پروگرام بدلنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں دوستوں نے سمجھایا مگر آپ ہنستے ہی رہے۔ گویا ان جھوٹی تسلیوں کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ ان حضرات کے رخصت ہونے کے بعد ہمارے ایک عزیز سے کہا۔ میاں قرآن مجید کچھ کو سناؤ۔ وہ دیر تک کلام پاک پڑھتے رہے۔ اور آپ آنکھیں بند کیے سنتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ یہ سمجھے کہ سو گئے ہیں۔ لہذا وہ خاموش ہو گئے۔ اور وہاں سے چلے گئے۔ آپ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور ہم سے کہا۔ تم ہی کچھ سناؤ۔ لو یہ عہد نامہ رکھا ہے اسے پڑھ کو سناؤ۔ میں نے عہد نامہ پڑھ کر سنایا۔ پھر آنکھیں بند کر کے خاموشی سے سنتے رہے۔ اور جب میں خاموش ہو گیا۔ تو پھر کچھ نہ بولے۔ واقعی سو گئے تھے۔ میں بھی بخار میں مبتلا تھا۔ لہذا اسی کمرے میں ایک طرف لیٹ گیا۔ کہ یکایک دو بجے کے قریب وہ ایک دم اٹھ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور اسی وقت سانس حلق میں اٹکنے لگی۔ میں ماموں صاحب کو دوسرے کمرے سے بلانے دوڑا تو فرمایا۔ بیٹا سنبھل کے"

اور بس روح پرواز کر گئی۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ والدہ صاحبہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ خود ہم کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سر کے اوپر سے آسمان اور پیروں کے نیچے سے زمین ہٹ گئی ہے۔ اب ہمارا کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ تمام آرائشیں یہ تمام بےفکریاں اور یہ تمام رنگینیاں ایک دم ہم سے منہ موڑ گئیں۔

فکرِ معاش

عشقِ تباں کا دور گیا، فکرِ معاش کے دن آ گئے۔ والد صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم کو اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس پوری شدت کے ساتھ ہوا اور ہم نے بجائے گھبرانے یا ہاتھ پیر ڈال دینے کے ایک عزم بالجزم کے ساتھ کمر باندھ لی۔ اور ماموں جان سے کہا کہ اگر آپ ہم کو کہیں کسی تنخواہ کی کوئی ملازمت دلوا سکیں تو دیر نہ کیجئے۔ ماموں صاحب ہماری حرکات سے ایک حد تک مایوس تھے۔ اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ پڑھے نہ لکھے اور نام محمد فاضل۔ وہ بیچارے اس کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئے۔ کہ ان حضرت کیلئے ملازمت آخر کس قسم کی ڈھونڈھی جائے۔ لکھے پڑھے ہوتے تو خود ان کے باپ کے بہت سے دوست تھے۔ اور سب کے سب اعلیٰ عہدوں پر مگر اب کسی سے کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ وہ تو سوچتے ہی رہے۔ مگر ہم نے اپنے لیئے ایک جگہ تجویز کر لی۔ اور ان سے کہا کہ مجھ کو خان بہادر سید الطاف حسین صاحب رضوی کے پاس لے کر چلیئے۔ وہ ہم لوگوں سے عزیز بھی ہیں۔ اور آج کل وہ ناصر ہم کے مفتی جیسے ڈاکٹر ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو مجھ کو

ہمدم کے عملہ میں لے لیں گے تو میں معمولی سے معمولی تنخواہ پر بھی کام شروع کر دوں گا یہ کام میری مرضی کا ہو گا۔ اور اس میں خود ترقی کر دوں گا۔ ماموں صاحب ان باتوں کے قائل تو نہ ہوئے مگر ہم کو لے کر خان بہادر سید محمد حسین صاحب علوی کے پاس گئے۔ سید صاحب نے پوری بزرگانہ ہمدردی فرمائی۔ اور ہم کو اسی وقت ایک پروانہ تقرری دے دیا کہ اسے لے کر سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم سے کل ملنا۔ وہ تم کو مناسب کام دے دیں گے۔ فی الحال تنخواہ چالیس روپیہ ماہوار ہے۔ اس کے بعد تم اپنی استعداد سے خود ترقیاں حاصل کرو۔

دفتر روزنامہ ہمدم

دوسرے دن ہم روزنامہ ہمدم کے دفتر پہنچے۔ سید جالب دہلوی کا پتہ پوچھ کر ایک ایسے کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایک لمبی سی میز پر چاروں طرف چار آدمی بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ اور ایک پانچویں بزرگ ایک علیحدہ میز پر اخباروں کے ڈھیر کے درمیان کاغذ پر تقریباً جھکے ہوئے نہایت تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ ترکی ٹوپی سے آپ شروع ہوتے تھے۔ جس کا پھندنا آگے پڑا ہوا تھا۔ اور سر کے سفید بالوں کا ایک گچھا ٹوپی کے آگے پیشانی پر گویا ٹوپی سے بغاوت کر کے نکل آیا تھا۔ بے ترتیب سی داڑھی کاغذ سے کچھ ہی فاصلہ پر قلم کی جنبشوں کے ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ اور کرسی کے نیچے دونوں ٹانگوں کے درمیان آزار بند زمین تک لٹکتا چلا گیا تھا۔ قلم تقریباً ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا حالانکہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ بیٹھے بیٹھے اونگھ گئے ہیں۔ ہم دیر تک آپ کی

توجہ کے امیدوار بنے کھڑے رہے۔ آخر آپ نے دس منٹ کے بعد زیرِ قلم صفحہ ختم کرتے ہوئے ایک نعرہ بلند کیا "بیٹھ جاؤ" اور دزدیدہ نظر سے اس خاکسار کو دیکھا۔

ہم نے عرض کیا "السلام علیکم"۔

نہایت بیزاری سے "وعلیکم السلام" اس طرح فرمایا گویا کہہ رہے ہیں کہ "تو خود والسلام علیکم"

ہم نے خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی کا خط پیش کر دیا جس کو پڑھ کر آپ نے ہم کو پہلے تو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد ایک ہی سانس میں ہمارے خاندان کی پوری تاریخ ہم کو اس طرح سنا دی گویا آپ خود اسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ ہم حیرت سے سنتے رہے۔ اور وہ فرماتے رہے۔

"آپ کے سب سے بڑے چچا حبیب احمد صاحب غالباً اس وقت ولایت تشریف لے گئے تھے جب آپ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے وہ پھر وہاں سے واپس تشریف نہیں لائے۔ آپ کو غالباً اطلاع ہو گی۔ کہ وہ شمسیات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اور ان کی ادبی اور صحافی اہمیت مسلّم سمجھی جاتی تھی۔ ہر چند کہ وہ خود پولیس کے اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ مگر ان کی صحافی دلچسپیاں پھر بھی کسی نہ کسی صورت سے کارفرما نظر آتی تھیں آپ کے سب سے چھوٹے چچا منشی فیاض احمد صاحب دہلی سے ایک روزنامہ اخبار نکالتے تھے۔ اور مجھ کو صحافت کا سب سے پہلا درس وہیں سے ملا ہے۔ آپ کے والد کو البتہ اخبار نویسی یا ادب کے کسی شعبہ سے براہِ راست کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ

غالباً آپ کے دوست کے چچا منشی سلطان احمد صاحب کو کوئی دلچسپی تھی مگر ان کے صاحبزادے یعنی ان کے چچا زاد بھائی ارشد تھانوی صاحب تو شاعر بھی ہیں۔ اور نہایت اچھے انشا پرداز بھی ہیں۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوں کہ آپ نے بھی اپنے لیے اسی میدان عمل کو پسند کیا ہے۔ میر احمد حسین صاحب آپ کا تقرر کر ہی چکے ہیں۔ میں آپ کو اس اخبار کے منیجر قاضی محمد حامد صاحب حسرت کے پاس بھیجتا ہوں۔ وہ آپ کو آپ کے کام کی نوعیت وغیرہ بخوبی سمجھا دیں گے۔ اس تمام گفتگو میں ہم کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ سید صاحب نے کہیں سانس بھی لی یا نہیں۔ اور نہ کسی لفظ کے درمیان کوئی فصل تھا معلوم ہوتا تھا۔ کہ الفاظ کی ایک زنجیر ہے جو منہ سے نکلتی چلی آ رہی ہے۔ البتہ آواز کی جھنجھناہٹ سے ضرور معلوم ہوتا تھا کہ حلق میں کوئی ویسی قسم کا ساؤنڈ بکس لگا ہوا ہے جس پر استعمال کی ہوئی سوئی لگا دی گئی ہے اور ہماری شاعرانہ روایات کا یہ ریکارڈ بوجہ کثرت استعمال سے گھس چکا ہے۔ گراموفون کے اس سب سے پہلے ماڈل پر بج رہا ہے۔ سید صاحب نے اپنی یہ تقریر ختم کرتے کچھ لکھا اور آواز دی لے جاؤ۔ دفتر کا ایک ملازم آیا تو ان کو وہ پرچہ دے کر ارشاد فرمایا کہ آپ کو قاضی صاحب کے پاس لے جاؤ۔"

قاضی محمد حامد صاحب حسرت ہمدم کے منیجر بھی تھے اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی۔ آپ کا مرتبہ سید جالب صاحب کے بعد سب سے زیادہ شاندار تھا۔ درحقیقت بھی کمال نظر آتا تھا۔ قاضی صاحب مجھ سے اس طرح ملے گویا پہلے سے واقف تھے۔ اور آپ نے بغیر کچھ دریافت کیے اپنے ہی کمرہ میں ہمارے لیے ایک علیحدہ میز لگوا دی۔

یہ معلوم ہوا کہ خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی نے قاضی صاحب کو کل ہی بلا کر ان سے کہہ دیا تھا کہ شوکت تھانوی میرے عزیز ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھا جائے امید ہے کہ یہ کام کے آدمی ثابت ہوں گے۔ بہر صورت ان کے کام کے متعلق مجھے پندرہ روز کے بعد رپورٹ کی جائے۔ اس لیے کہ باوجود عزیزداری کے میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہمدم کے ذریعہ کنبہ پروری کروں۔ قاضی صاحب کے لیے یہی اشارہ کافی تھا۔ لہذا آپ بہت ہی مہربانی کے ساتھ پیش آئے، اور سب سے پہلے ہم کو یہ کام بتایا کہ آپ ہمدم کے دو مہینے کے فائل لے کر تمام مقالات افتتاحیہ اور شذرات پڑھ ڈالیے تاکہ آپ کو حالات حاضرہ کے علاوہ ہمدم کی پالیسی کا اندازہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ سے کوئی تحریری کام لیا جا سکے گا۔ ہم نے ہمدم کے فائل نہایت غور سے پڑھنا شروع کر دیئے دفتر میں بھی پڑھتے تھے اور گھر بھی لے آتے تھے پڑھنے کے لیے۔ آخر تین دن میں ہم نے دو مہینے کے فائل پڑھ ڈالے مقالات افتتاحیہ کو پڑھا۔ شذرات پر نظر ڈالی۔ اور مزاحیہ کالم دو دو باتیں بھی پڑھ ڈالیں۔ اب قاضی صاحب نے ہم سے چھوٹے چھوٹے شذرات لکھوانا شروع کیے۔ اور کچھ ترجمہ کا کام ہمارے سپرد ہوا خبروں کے ترجمہ میں تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ مگر شذرات سید جالب صاحب کے پاس بھیجدیئے جاتے تھے۔ اور ان پر سید جالب صاحب سرخ روشنائی سے اس طرح اصلاح فرماتے تھے۔ کہ تمام سیاہ عبارت پر سرخ عبارت طاری ہو کر رہ جاتی تھی۔ اور کاغذ کو دیکھنے سے پتہ چلتا تھا۔ کہ گویا روس کی سرخ فوج نے حبش پر حملہ کر دیا ہے۔ اور روس کے سرخ سپاہی حبشیوں کو

چھاپے بیٹھے میں شروع شروع میں تو حال یہ تھا کہ ہمارے شذرے کا شاید ہی کوئی لفظ سید
صاحب کی سرخ روشنائی سے بچا ہو۔ مگر رفتہ رفتہ قلم کا عمل کم ہوتا گیا۔ اب ہر سطر میں کچھ
سرخ نشانات نظر آنے لگے۔ اس کے بعد ہر دو تین سطروں کے بعد کچھ سرخ تصحیحیں
نظر آتی تھیں۔ مگر یہ تو ارمان ہی رہ گیا کہ ہمارا کوئی شذرہ سید صاحب کے ملاحظے سے گذر کر بغیر
اصلاح کے آجاتا۔ سید صاحب کی بعض اصلاحیں ہماری سمجھ میں نہ آتی تھیں، مگر ہم چپ
رہتے تھے۔ آخر ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہمارے ایک سب لیڈر میں صرف ایک اصلاح
ہے یعنی ہم نے لکھا تھا "نقطہ نظر" اور آپ نے اس کو کاٹ کر اوپر لکھ دیا "زاویہ نظر" اب ہم سے
ضبط نہ ہو سکا۔ اور ہم وہ سب لیڈر لے کر سید صاحب کے پاس پہنچ گئے اور ان سے
عرض کیا: میں یہ سمجھا نہیں کہ آپ نے نقطہ نظر کاٹ کر زاویہ نظر کیوں بنا دیا ہے۔ میرے
نزدیک تو کوئی ایسا فرق ان دونوں میں نہیں ہے۔" سید صاحب نے اسی طرح نہایت
بے پروائی سے بغیر سانس لیے فرمایا بہت بڑا فرق ہے۔ نقطہ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ جو
بات آپ کہہ رہے ہیں، اس کی اصلیت پر آپ کی نگاہ یقین کے ساتھ پہنچ چکی ہے
اور اب اس میں آپ کے نزدیک کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ اور زاویہ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ
آپ کی نظر اس نقطے کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ یعنی وہ بات جو آپ بیان کر رہے ہیں
غلط بھی نکل جائے تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارا نقطہ نظر نہیں، بلکہ زاویہ نظر تھا۔ ایک
اخبار نویس کی حیثیت سے آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ یہ ذمہ داری صرف اسی
بات کی لیں جس کے متعلق آپ کو واقعی یقین ہو کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ اس کے

علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جہاں تک بجٹ کے پہلو کسی ذمّہ داری کے سلسلہ میں آپ نکال سکتے ہوں نکالیں۔ زاویہ نظر لکھ کر آپ نے ذمّہ داری تو لے لی۔ مگر بجٹ کی ایک صورت بھی اپنے لیے محفوظ کر لی۔ اور نقطۂ نظر لکھ کر یہ ہوگا کہ ذمہ داری تو آپ لے لیں گے مگر بجٹ کا کوئی امکان نہ ہوگا۔ سیّد صاحب کا نکتہ ہمارے ذہن میں اتر گیا اور اب تک اصلاحوں کے سلسلہ میں جتنی شکایتیں ہمارے دل میں تھیں سب دور ہو گئیں۔

سیّد صاحب نے کچھ ہی دنوں کے بعد ہم سے کہا کہ آپ مزاحیہ کالم "دو دو باتیں" بھی لکھا کیجیے۔ لہٰذا ہم نے یہ کوشش بھی کی اور اس سلسلہ میں بڑے خوش نصیب ثابت ہوئے کہ سیّد صاحب جن کے متعلق تمام عملہ کو یہ شکایت تھی کہ کبھی کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے "دو دو باتیں" دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں نے یہ فیصلہ آپ کے شذرات اور سب ایڈیٹر وغیرہ دیکھ کر کیا تھا۔ اس لیے کہ آپ کی سنجیدہ تحریروں میں جو شگفتگی ہوتی تھی۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اگر آپ مزاحیہ کالم لکھیں تو اپنی اس شگفتگی سے زیادہ کام لے سکیں گے۔ دراصل مزاح لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے بلکہ میں تو اس کو اس حیثیت سے بہت ہی بڑا درجہ دیتا ہوں کہ ایک مزاح نگار کو گویا ایک پگڈنڈی پر چلنا پڑتا ہے۔ اس طرف ذرا سا ہٹ جائے تو ابتذال اور پھکڑ بن کر رہ جاتا ہے۔ مزاح اور اس طرف ذرا سا ہٹ جائے تو سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ دراصل اس کے لیے قدرتی طور پر بعض طبائع ہوتے ہیں۔ اور میرا یہ خیال درست نکلا کہ آپ مزاح نگاری میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔" سیّد صاحب کی طرف سے

اس حوصلہ افزائی کے بعد ہم سے ہمدم کا یہ کالم اپنے ذمّہ لے لیا۔ اور مستقلاً وہ دو باتیں لکھتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ پنجاب کے اخبار روزانہ ہمدم کے "دو دو باتیں" لکھنے والے کو اپنے کالموں میں "باتونی" کے نام سے یاد کرنا شروع کر دیا۔

سیّد جالب سے اب روز بروز قرب حاصل ہو رہا تھا۔ پہلے ہم ان کے شاگرد تھے پھر ماتحت ہوئے اور اب وہ ہم کو اپنا خورد سمجھنے لگے تھے مگر اتنی مجال اب بھی نہ تھی کہ ہم ان سے کسی معاملہ میں بحث کرتے۔ دوسرے ڈرتے بھی تھے کہ اگر کوئی بات پوچھ بیٹھے۔ تو پھر یہ اسی وقت بات بتائیں گے۔ بات کی جڑ بتائیں گے اور بات کے پھول پتے تک سب بتا جائیں گے۔ کسی قسم کی کوئی بات ہو۔ کسی فن سے متعلق شاعری۔ زردوزی۔ معماری۔ ڈاکٹری۔ مصوری۔ موسیقی۔ خیاطی غرض تو کیا کہ دنیا کے کسی شعبہ کو لے لیجئے۔ اور سیّد صاحب سے کسی بات کے متعلق کچھ پوچھ بیٹھئے۔ بس آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے اور جب تک اس بات کے سلسلہ میں آپ میں ڈاکٹریٹ کی قابلیت پیدا نہ کر دیں گے۔ نہ آپ دم لیں گے نہ زبان لگائیں گے نہ سانس لیں گے۔ غلطی سے پوچھ لیا کہ سیّد صاحب آپ یہ حقہ کسی خاص اہتمام سے بھرواتے ہیں۔ یا جس تمباکو کا ہو اور جس طرح چاہے بھر دیا جائے آپ پی لیتے ہیں۔ بس جناب سیّد صاحب شروع ہو گئے کہ جی ہاں حقے کے سلسلہ میں میری پسند تو خاص کوئی بھی نہیں ہے مگر میں لکھنؤ کے خمیرے میں گڑ کچھ درکار تمباکو ملا کر زیادہ پسند کرتا ہوں۔ دراصل میں بچپن ہی سے حقّہ کے مرض میں مبتلا ہوں۔ والد صاحب میرے لئے پیوٹر کی نو خیدی سے ایک خوبصورت سی

گڑگڑی ہر سال دیا کرتے تھے۔ اور یہیں اس کو عطر میں بسا کر استعمال کرتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ
یہ اہتمام ختم ہو گیا۔ اور حقہ کے سلسلہ میں میں نے جب غور کرنا شروع کیا تو عظیم اللہ خاں تھے
سے لے کر لکھنؤ کے حقے تک سب ہی کا مزا چکھا۔ اور آخر میں اس بات کا قائل
ہونا پڑا کہ خالص حقہ پنجاب کے لوگ پیتے ہیں۔ ان کی تمباکو میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی
میں نے پنجاب کی اس تمباکو کو گنڈے کی آگ رکھ کر پیا ہے اور میری رائے یہ ہے
کہ حقے کے لیے سب سے بہتر آگ گنڈے کی ہوتی ہے جس کی آنچ میں ایک قسم کا توازن
ہوتا ہے۔ اور تمباکو ایک دم بھڑک کے یا تیل اتر کر وقت بجھنے نہیں پاتی۔ یہ مشک وغیرہ تو
در اصل امرا کے تکلفات ہیں۔ حالانکہ طبی حیثیت سے مشک کا استعمال یوں بھی مفید
ہے کہ دھواں زیادہ سے زیادہ صاف ہو کر آتا ہے۔ ورنہ پھیپھڑوں کے لیے
ایک قسم کی ورزش کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اب کہاں تک اس سلسلہ میں لکھا
جائے رشید صاحب اسی حقہ کے سلسلہ میں نظام سقہ کے حقے سے لے کر لوجاتیں
گلی کے حقے تک پہنچ کر بھی دم نہ لیتے۔ حقے کے تمام اقسام پیچوں کی ساخت چلموں
کی قسمیں۔ تمباکو بنانے کے مختلف طریقے۔ ہر قوم میں حقے کی جداگانہ روایات۔ حقے
کے بعد سگریٹ کی ایجاد اور اس کی ضرورت پائپ اور سگار۔ مختصر یہ کہ سب ہی پر
روشنی ڈالتے اور مختلف تمباکو فروشوں کے تجربے پیش کرتے چلے جاتے تھے
اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان حضرت نے زندگی بھر حقے ہی کے متعلق تحقیق و تفتیش کی ہے مگر
نہیں ان سے تو جس موضوع پر بھی گفتگو کیجیے اسی ہمہ دانی کا قائل ہونا پڑتا تھا۔ دفتر

بھی ہر روز نہ جانے کتنے لوگ آپ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اور آپ اُن میں سے ہر ایک
کے خاندان سے اِس قدر واقف نکلتے تھے کہ شاید وہ لوگ خود بھی نہ ہوتے ہوں گے
نہایت وثوق سے کہہ دیا کرتے تھے کہ "جی ہاں آپ کو نہیں معلوم ہے مگر آپ کے والد
محترم کے عم محترم کی خالہ صاحبہ محترمہ کے خاندان کی تمنا کو والی لکھا ہے یہ تعویذ برآمد
ہوا تھا۔ دراصل یہ تعویذ خانِ خاناں بیرم خاں سے ہوتا ہوا راجہ ٹوڈرمل کے پوتے کے
پاس پہنچا۔ اور وہاں سے میر مہدی مجروح کے خسر محترم میر گھسیٹے کے پاس آیا۔ پھر یہ
تعویذ مدتوں غائب رہا۔ اور آخر کار جمنا کے کنارے مقام کالپی ایک خرانہ عبدالستار
نامی ایک مغل بند کو ملا۔ اس نے آپ کے والد محترم کے عم محترم کی خالہ محترمہ کے شوہر
شوہر امانت علی خاں صاحب کو وہ تعویذ دے دیا تھا۔ اور اس طرح آپ کے خاندان
تک یہ تعویذ آیا۔" اب وہ حضرت اور باقی تمام سامعین حیران رہ جاتے تھے۔ کہ
سید صاحب کو آخر یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اسی طرح وہ ہر بات اور ہر
روایت سے اِس قدر با خبر تھے کہ ان کو زندہ انسائیکلو پیڈیا کہنا غلط نہ ہوگا۔ افیون سے
شوق فرماتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اپنے کو رند مشرب کہا کرتے تھے۔ سید صاحب
کی کچھ دنوں کے بعد منتظمان سے اَن بن ہو گئی اور آپ ہمدرم سے علیحدہ ہو گئے۔ اس
موقع پر سید صاحب کو عملہ نے ایک رخصتی پارٹی دی۔ چنانچہ فوٹو گروپ کے لیے سید
صاحب نے خاص طور پر اہتمام سے صاف کپڑے پہنے۔ اور سیاہ شیروانی زیب تن
فرمائی۔ مگر اسی بیچ دیکھ کے سامنے یعنی اوپر کے تین بٹن بند باقی سب کھلے ہوئے۔ ہاتھ

میں گھسیڑی۔ اور چھتری اور ہاتھ کے بیچ میں ایک بڑا سا رومال۔ ڈوری دار سیاہ ترکی نما مخروطی ٹوپیا کھلی ہوئی۔ میں نے عرض کیا سید صاحب جوتے کی ڈوری تو باندھ لیجئے۔ اس کا جواب آپ کے صاحبزادے عشرت صاحب نے دیا کہ "حاجت متشابہ طبیعت"۔ میں نے کہا۔ روسو والا ہے ذرا ہم بھی تو کچھ۔ سید صاحب نے کہا: ہمارے میاں عشرت جو جی میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں۔ سید صاحب کے متعلق زیادہ تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں ہے میں ایک مستقل مضمون سید جالب دہلوی لکھ چکا ہوں۔ اور شبستان محل میں بھی سید صاحب سے لوگ مل چکے ہوں گے۔

سید جالب دہلوی کے بعد ہمدم کی ادارت ایک ہفتہ تک ملک نصر اللہ خان عزیز مطابق مدیر مدینہ بجنور نے فرمائی۔ آپ کے بعد قاضی محمد حامد صاحب حسرت قائم مقامی کرتے رہے اور دو دن اس خاکسار کے پاس چارج رہا۔ پھر چوہدری رحم علی صاحب ہاشمی نے باضابطہ ادارت سنبھال لی۔

چوہدری رحم علی الہاشمی

چوہدری رحم علی ہاشمی سے بھی لوگ شبستان محل میں مل چکے ہوں گے۔ آپ ایک کہنہ مشق اخبار نویس ہونے کے علاوہ اردو اور انگریزی جرنلزم کے بہت سے گرم و سرد کا تجربہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ اسی ہمدم میں پہلے بھی رہ چکے تھے اس کے بعد متعدد اردو اور انگریزی اخبارات کو نکال چکے تھے۔ آدمی بہت عمدہ

نہایت شریف اور بے حد نیک تھے۔ ہم لوگ اِن کے ماتحت کم اور دوست زیادہ تھے
کھلانے پلانے والے آدمی تھے۔ اور اِس میں دراصل آپ کا ذاتی قصور بھی نہ تھا
آپ کی بیگم صاحبہ اِس سلسلہ میں بہت ہی دریادل واقع ہوئی تھیں۔ اور آپ کی
دال گھر میں کبھی نہ گلتی تھی۔ بنیادی جناب صاحب کے زمانہ میں تو دفتر محض دفتر تھا مگر اب
دفتر کی حیثیت دفتر کے علاوہ کلب کی سی ہو گئی تھی۔ بیگم ہاشمی اکثر دعوتیں کرتی رہتی تھیں
اکثر سے مراد تقریباً روز سے ہے۔ خصوصاً ہمارے لیے کچھ راشن مقرر ہو گیا تھا۔ مثلاً
دو پان صبح دو پان شام۔ چائے اور کبھی اگر کوئی خاص چیز پکی تو وہ ہاشمی صاحب بہت
شوق سے آکر کہتے تھے۔ کہ بیگم نے آپ کو کھانے پر یاد کیا ہے۔ ماش کی کھچڑی کے
متعلق بیگم ہاشمی کو ہماری کمزوری کی اطلاع مل چکی تھی۔ لہٰذا وہ اکثر اس سلسلہ میں یاد فرماتی
تھیں۔ پھر بیگم ہاشمی نے بڑے بنا کر عنایت فرمانا شروع کئے۔ جن کا سلسلہ اب تک
قائم ہے۔ قصہ مختصر یوں کہ ہم نے ان کو بہت جلد اپنا لیا۔ اور اِس سلسلہ میں ہمیشہ فائدے
ہی رہے۔ پانوں کی نہایت خوبصورت خس پوش ڈلیاں ہم کو ملنے لگیں۔ مٹھائی اور
ناشتہ میں پہلے تکلفات دیکھے جو شہر سے قدم قدم پر ہم کرتے تھے۔ وہ کم ہو گئے مثلاً
ایک مرتبہ نہایت صبر آزما قسم کے سنبوسے تیار کئے گئے۔ اور اب جو ہم کھاتے ہیں۔
تو معلوم ہوا کہ ان میں گھاس بھری ہوئی ہے۔ ان حالات کے ماتحت عافیت اسی
میں نظر آئی کہ چپکے سے ان کے شوہر کا سالا ہونا منظور کر لیں۔ خود ہاشمی صاحب کی
جو گت بنا کرتی تھی۔ وہی ہمارے لیے بے حد سبق آموز تھی۔ ہاشمی صاحب کی قسم

قابلیت اس گھریلو ذہانت کے سامنے بغلیں جھانکنے لگتی تھی۔

ہمدم کا یہ دور بہت ہی ہنستے کھیلتے گذر رہا تھا۔ ہمارے سب ساتھی ہاشمی احمد صاحب اشرفی مرحوم، یعقوب خاں صاحب کاظم وغیرہ آپس میں دوست اور ایک دوسرے کے صحیح معنوں میں ہمدرد تھے۔ خود ہاشمی صاحب نہایت نیک نفس آدمی تھے۔ اور اب چونکہ ہماری مشق کافی بڑھ چکی تھی۔ لہذا ہمارے ذمہ جتنے کام تھے وہ گویا خود بخود ہو جایا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں ملک کے ادبی رسائل میں بھی کافی لکھا

نسیم انہونوی

ہمدم کا ہی دور تھا کہ ایک روز جناب وصل بلگرامی ساتھ لئے ہوئے ایک صاحب ہمارے پاس تشریف لائے۔ آنکھوں میں سُرمہ، پیروں میں لغزش۔ اداؤں میں عروسیت اور ایک عجیب الھڑپن معلوم ہوا کہ آپ سید محمد نسیم صاحب انہونوی ہیں۔ اور رسالہ اکتشاف کے ایڈیٹر ہیں۔ رسالہ کا تازہ پرچہ ساتھ لائے تھے۔ اور رسالہ کے لیے قلمی معاونت چاہتے تھے۔ ان حضرت میں اپنی طرف متوجہ کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ ہم نے قلمی معاونت کا وعدہ کر لیا۔ اور اپنے مضامین دینے کے علاوہ دوسروں کے مضامین دلوانے کا وعدہ بھی کر گزرے۔ اب کیا تھا نسیم صاحب سے روز ملاقات ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ہم کو ان کے دفتر جانا پڑا۔ جو انجمن عالیہ ایک آنہ فنڈ کے دفتر کے ایک گوشہ میں تھا۔ یہ رسالہ دراصل اسی انجمن کا پرچہ

تھا۔ مگر اب تک اس سے کام صرف یہ لیا جاتا رہا کہ چندہ دینے والوں کا شکریہ دستاویز کی
صورت میں پیش کر دیا جائے۔ مگر نسیم صاحب نے اس کو ادبی شکل دینا چاہی۔ اور وہ بہت
کامیاب ہوئے۔ انجمن کے سر سید نما سیکرٹری مولوی سید خلیل احمد صاحب سے بھی ملاقات
ہوئی۔ جو بجائے خود شخصیت کے اعتبار سے ایک ادارہ معلوم ہوتے تھے۔ معلوم ہوا کہ
آپ شعر بھی کہتے ہیں۔ اور عمر وہ تخلص ہے۔ یہ تخلص البتہ ہم کو کچھ عجیب اور کچھ چلبلا
سا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی اپنا تخلص کانپوری رکھ لے۔ بلکہ گو لہ گو کر ان تا طور ارادہ کیا کہ ان
سے کہہ دیں کہ اتنا ہی ٹیا تخلص رکھنا تھا۔ تو ایک آنہ خند تخلص کیوں نہ رکھا۔ مگر یہ دیکھ
کر چپ ہو گئے۔ کہ ان کے یہاں کی تو ہر چیز نرالی ہے۔ مثلاً پاخانہ پہ سائن بورڈ لگا تھا
صحت خانہ۔ نہ جانے کتنے آدمی ہسپتال کے دھوکے میں وہاں چلے گئے ہونگے
سید خلیل احمد صاحب ویسے نہایت عمدہ آدمی ثابت ہوئے۔ بچے مرد مومن اور
اور مومن کی جو ایک خاص پہچان بتائی گئی ہے۔ شرمیلا ہونا۔ یہ بات تو ان میں اس
حد تک نظر آئی کہ سر سید نما داڑھی اور بھرپور شرم ان دونوں کی آمیزش سے انسان
چکرا کر رہ جائے۔

نسیم صاحب ہمیشہ رسالوں کے معاملے میں بڑے اولوالعزم قسم کے آدمی
ہیں۔ خوب خوب نمبر نکالتے ہیں۔ چاہے دیوالہ ہی کیوں نہ نکل جائے۔ دل کے
ارمان ہمیشہ ضرور پورے کریں گے۔ وہ اپنے زیر اہتمام نکلنے والے پرچوں کے خاص
نمبر اس طرح نہیں نکالتے کہ یہ اخباروں یا رسالوں کے خاص نمبر ہیں بلکہ یہ سمجھتے

ہیں۔ کہ یہ اولادوں کی شادیاں ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی انکشاف کے مختلف خاص نمبر نکلے۔ ایک نمبر تو ایسا تھا کہ اس کا سرورق بید پیپر کا تھا۔ بے شمار تصویریں دیتے تھے بہتر سے بہتر مضامین جمع کرتے تھے۔ اور آخر کار جس وقت وہ خاص نمبر پریس سے لے کر آتے تھے۔ چہرہ پہ انبساط کی وہ لہریں ہوتی تھیں۔ گویا دلہن بیاہ کر لاتے ہیں۔ اب ان خاص نمبروں کی ترتیب میں ہم بھی برابر کے شریک تھے۔ اور نسیم صاحب اور ہمارے درمیان بغیر کسی تصفیہ کے گویا یہ فیصلہ ہو گیا تھا۔ کہ ہم ان کی تجارتی صلاحیت کو سراہتے ہیں اور وہ ہماری ادبی حیثیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نے تو پھر ان کی ادبی حیثیت کا بھی اعتراف کرنا چاہا تھا مگر وہ اس سلسلہ میں کچھ سنجیدہ نظر نہ آئے۔ افسانے لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے مگر اس کو کوئی ادبی کارنامہ نہ سمجھتے تھے۔ البتہ اگر ان کی کسی تجارتی رمز کو سمجھ کر ہم نے کبھی داد دے دی۔ تو وہ اپنی آنکھوں میں ایک خاص خوشی کی چمک پیدا کر کے ہم کو اس طرح دیکھتے تھے گویا نہایت سمجھدار آدمی سمجھ رہے ہیں۔ نسیم صاحب کی تجارتی حیثیت اور صلاحیت کو ہم زیادہ نمایاں نہ کر سکے۔ مگر ہماری ادبی صلاحیت کو وہ برابر اچھالتے رہے۔ اور آج تک اچھالتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہر ادبی کارنامہ پہ دوستوں میں ان سے زیادہ خوش ہونے والا آج تک کوئی نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھ کر خوش نہیں ہوتے کہ یہ شوکت کا کارنامہ ہے۔ بلکہ ان کو تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا یہ ان ہی سے متعلق کوئی چیز ہے۔ نسیم صاحب کا ذکر اس تذکرہ میں بار بار آئے گا۔ اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہوں گے۔ اس موقع پہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی

ضرورت نہیں کہ اب ہم کو ایک ایسا ذریعہ مل گیا تھا۔ کہ ہم اپنی ادبی سرگرمیوں کو جس طرح چاہتے جاری رکھ سکتے تھے۔

مولانا سیماب سے جنگ

حضرت ساغر نظامی اور مولانا سیماب سے ہمارے تعلقات اب تک نہایت شگفتہ تھے سنہ ۱۹۲۳ء سے یہ مراسم تھے۔ اور اب تک کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی جس سے ناگواری کا کوئی پہلو کسی طرف سے نکلتا ہو مگر آج کل مولانا سیماب کی ادارت میں آگرہ سے ایک اخبار نکل رہا تھا "تاج" اور اس اخبار میں ایک آدھ بات ایسی ناگوار چھڑ گئی جس کا جواب ہم کو ہمدم میں دینا پڑا۔ مولانا کے اخبار نے اس کا کچھ سخت جواب دیا۔ الغرض باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ ہمدم کا "دو دو باتیں" والا کالم مولانا کے لیے وقف ہو گیا۔ مولانا نے اپنے اخبار کے علاوہ اپنے ایک شاگرد دلخواجہ شاہ احسن جمیل کے اخبار فرشتہ میں بھی ہمدم کے خلاف کچھ لکھوانا شروع کیا۔ فرشتہ کی ایک تحریر کا جواب لکھتے ہوئے ہم نے ہمدم میں لکھ دیا کہ "فرشتہ تو فرشتہ اس کے معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو پتا اس کی خبر نہیں کہ ہمدم روزانہ اخبار ہے۔ اور یہ گندے دار چھپنے والے ہفتہ وار اخبار اُس کی روزانہ کی چوٹوں کا اگر ہفتہ میں ایک بار جواب بھی دے سکیں۔ تو بھی ہفتے کے باقی چھ دن سہاتے گذر جایا کریں گے بغیر؟ اس میں فرشتہ کی رعایت سے معلم الملکوت والی چوٹ کی تاب مولانا نہ لا سکے۔ اور تاج کے دوسرے ہی نمبر میں ان کا ایک منظوم پیغام ہمدم کے بانی

کے نام چھپا۔ جو ہمارے ذہن میں اس طرح محفوظ رہ گیا ہے کہ سے

ادب باقی ہے ان میں اور استعداد باقی ہے
فقط طاغوتیوں کی نسل مادر زاد باقی ہے
کوئی ہمدم سے باتونی سے جا کر صرف یہ کہہ دے
کہ شیطاں مر گیا۔ اس کی مگر اولاد باقی ہے

اس کے بعد بھی بہت دنوں تک اس لڑائی کا خاتمہ نہ ہوا۔ اور ادھر سے ہمدم ادھر سے تاج اور فرشتہ برابر ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھ رہے تھے۔ آخر ایک دن ہاشمی صاحب کی رائے یہ ہوئی کہ اب اس جنگ کو ختم کر دینا چاہیے۔ چنانچہ مولانا سیماب کی تازہ غزل پیمانہ کے تازہ پرچہ میں چھپی تھی۔ ع

میت نہ مری جا کر ویرانے میں رکھ دینا

ہم نے اس پر تنقید کی اور تمام اشعار پر تنقید کر چکنے کے بعد مقطع پر پہنچے سے

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے
جذبات کی اک بجلی پروانے میں رکھ دینا

تو ہم نے لکھ دیا کہ اب جب کہ مولانا نے خود یہ کہہ دیا ہے کہ ع

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے

ہم کو مولانا کے متعلق اب کچھ نہیں کہنا ہے۔ اور ہم آج اس بحث کو ختم کر رہے ہیں۔

اس ناگوار بحث کے بعد جب مولانا سے پھر ملاقات ہوئی تو ان کا دل بالکل صاف تھا۔ اور ہم بھی ان سے شاکی نہ تھے۔ ساغر صاحب سے بھی خوشگوار تعلقات قائم رہے۔ اور مولانا سیماب کو آج بھی ہم اپنا محترم بزرگ سمجھتے ہیں۔ اس اخباری لڑائی کو ہم دونوں بھول چکے ہیں۔ اور اگر ہم تھوڑی سی خیانت کر سکتے تو اس تذکرے میں بھی اس ذکر کے آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

سودیشی ریل

ابھی ہم ہمدم ہی میں تھے۔ اور اخبار کی ذمہ داریوں سے جو فرصت ملتی تھی اس کو دوسری ادبی دلچسپیوں میں صرف کرتے تھے۔ مختلف رسالوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ اور اب زیادہ تر فکاہی چیزیں لکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں رسالہ نیرنگِ خیال لاہور کے سالنامہ ۱۹۳۰ء کے لیے ہم نے ایک مزاحیہ افسانہ سودیشی ریل کے نام سے لکھا۔ اس افسانہ کے چھپنے سے پہلے ہی نیرنگ خیال کے اسسٹنٹ ایڈیٹر حفیظ ہاشمی مرحوم کا ایک تفصیلی خط ہم کو ملا جس میں اس افسانے کی بے حد تعریف کی گئی تھی۔ ہاشمی مرحوم سے ہم بالکل واقف نہ تھے نہ اس سے پہلے کبھی خط و کتابت ہوئی تھی۔ ہم نے اس تعریف کو یونہی رسمی سی چیز سمجھ کر سرسری سا شکریہ ادا کر دیا مگر سالنامہ نیرنگ خیال کے شائع ہونے کے بعد اب جسے دیکھئے وہی ہم کو خط لکھ رہا ہے۔ بہت سے مقامی حضرات ملنے آئے۔ متعدد رسالوں اور اخباروں نے

اس کو نقل کیا۔ ہندی، گجراتی، بنگالی اور مرہٹی اخباروں میں اس کے ترجمے شائع ہوئے
یہاں تک کہ ڈاکٹر شفیع صاحب کرمی بزرگ ہیں انہوں نے اس کا انگریزی ترجمہ
ولایت کے گلوب نامی کسی اخبار میں چھپوا دیا۔ یہ ترجمہ ہم نے خود نہیں دیکھا مگر ڈاکٹر اولوی صاحب
نے یہ روایت سنائی۔ جس کے معتبر ہونے میں ہمیں آج بھی شک ہے۔ مگر مختلف
اُردو، ہندی، بنگالی اور مرہٹی اخبارات جن میں یہ افسانہ نقل ہوا یا ترجمہ کر کے چھاپا گیا
اِن کی تعداد پچیس ہے۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اسی افسانہ نے ہم کو مزاح نگاروں
میں باضابطہ طریقہ پر شامل کر دیا۔ بلکہ اس دور کے بعض تذکرہ نویسوں نے صاف
صاف لکھ دیا ہے۔ کہ "شوکت تھانوی کی مقبولیت کا سنگِ بنیاد ان کا افسانہ
سودیشی ریل ہے"۔ اس افسانہ کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد مختلف باتیں مشہور
ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ یہ سرکاری پروپیگنڈے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور کسی سرکاری
اشارے کے ماتحت لکھوایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ایک دوسری عجیب
بات یہ بھی کہی گئی کہ یہ افسانہ کسی انگریزی افسانہ سے ماخوذ ہے یہ بھی بالکل غلط
ہے۔ یہ افسانہ قطعاً طبع زاد ہے۔ اور بغیر کسی تحریک کے لکھا گیا تھا۔ اس افسانہ
کا مقصد دراصل یہ بھی نہ تھا کہ اس سے قومی جذبات اور قومی تخیل کو کوئی صدمہ
پہنچے بلکہ یہ ایک خالص اصلاحی چیز تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

سودیشی ریل کے بعد

سودیشی ریل کی مقبولیت کے بعد اب جس کو دیکھئے۔ وہ ہم سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی سودیشی چیز لکھو اور تو اور خود ایڈیٹر نیرنگ خیال نے سودیشی ریل کے دوسرے حصے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے ان تمام فرمائشوں کی تعمیل کر دی مثلاً نیرنگ خیال کے لیے ایک مضمون لکھا "سودیشی ریل کے بعد" نسیم انہونوی کی فرمائش پر دو تین مضامین لکھے۔ سودیشی ڈاکخانہ۔ سودیشی کونسل اور سودیشی عدالت وغیرہ مگر ان میں سے کسی میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ دراصل ان مضامین کا لکھنا ہی ہماری غلطی تھی ہم کو سودیشی ریل کی اس مقبولیت سے خود متاثر نہ ہونا چاہیے تھا۔ اور سودیشی ریل ہی کو معراج سمجھ کر آگے قدم کے اور آگے بڑھ جانے کی کوشش نہ کرنا تھی مگر یہ باتیں اس وقت نہ ہم خود سمجھ سکے نہ کوئی ہم کو سمجھا سکا۔ نتیجہ یہ کہ سودیشی ریل کے بعد سودیشی مضامین لکھ کر ہم نے انتہائی کمزوری کا ثبوت دیا۔ اس میں شک نہیں کہ سودیشی ریل کے بعد ہماری ادبی رفتار بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہیے تھا کہ اب پڑھنے والے ہم سے سودیشی ریل طلب نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس سے آگے کچھ اور۔ اور ہم یہ کر رہے تھے کہ سودیشی ریل پر بیٹھے ہوئے ہم منزلیں طے کرتے چلے جاتے تھے۔ حالانکہ خود ہی لکھ چکے تھے کہ اس بیچاری ٹرین کو کچھ ہی نہ تھا اور نہ اس کی کوئی سمت مقرر تھی کہ مشرق کی طرف جائے گی یا مغرب کی طرف چلے گی یعنی کہیں پر ختم سکے ساتھ زیادہ دور چل سکتے۔ ہر طرف اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔

اودھ اخبار

ابھی ہماری ادبی حیثیت پوری طرح پختہ بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ملازمت خطرہ میں پڑ گئی یعنی یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہمدم کو بند کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ اس خبر کی تحقیقات شروع کرنے بھی نہ پائے تھے کہ تصدیق آگئی اور ہمدم واقعی بند کر دیا گیا۔ یعنی ملازمت ختم اور اب ہمارا اللہ حافظ۔ اب تک ہم نے رسالوں کے لیے جو کچھ لکھا تھا اس کا کوئی معاوضہ کہیں سے نہ لیا تھا۔ نسیم صاحب کے لیے جس قدر کام کرتے تھے اس کے معاوضے کا تو ظاہر ہے کہ کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ ہمدم کے بند ہونے کے بعد ہم کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں کچھ خلا سا محسوس ہونے لگا۔ مگر ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ ہم کو اطلاع ملی کہ روزنامہ "اودھ" اخبار کے لیے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم اودھ اخبار کے دفتر پہنچے۔ اور سید نور الحسن صاحب سے ملے جو اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ ہم نے معلوم نہیں کیوں ان سے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ ہم ملازمت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ حاضری کی وجہ یہ بتائی کہ ہم کو اودھ اخبار میں کچھ اشتہار شائع کرانا ہیں۔ اور چونکہ اب تک ہم آپ کی برادری کے ایک رکن تھے۔ یعنی ہمدم کے عملہ ادارت میں لہٰذا ہم خاص رعایت چاہتے ہیں۔ نور الحسن صاحب نے ہم کو پہلے ہی پہچان لیا تھا اور وہ خود ملازمت پیش کرنا چاہتے تھے مگر وہ بھی کچھ شرماتے سے جاتے تھے۔ آخر جب ہم اشتہارات کا نرخ وغیرہ معلوم کر چکے

تو نور الحسن صاحب نے ایک مرتبہ جی کڑا کر کے ہم سے کہہ ہی دیا۔ کہ ہمدم سے آپ الگ ہو گئے ہیں تو ادھر اخبار میں آجائیے۔ ہم نے کوئی اشتیاق تو ظاہر نہیں کیا اور نہ یہ راز کھلنے دیا۔ کہ ہم کو منہ مانگی مراد مل رہی ہے۔ البتہ یہ کہہ دیا کہ میں یہاں کے حالات سے واقف نہیں ہوں۔ معلوم نہیں آپ کیا تنخواہ دلوا سکیں گے۔ اور کیا شرائط ہوں گے تمام باتیں مجھے معلوم ہوں تو میں غور کروں گا۔ سید نور الحسن صاحب نے تھوڑی دیر میں تمام حالات ہم پر واضح کر دیئے۔ اور اسی دن ہم اس اخباروں کے باوا آدم کے عملہ ادارت میں آگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ خود سید نور الحسن صاحب مستقل ایڈیٹر نہ تھے۔ بلکہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب بغرض تبدیل آب و ہوا فوراً جیل تک گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا آپ ان کی قائم مقامی کر رہے تھے۔ مگر اخبار پر آپ کا نام قائم مقام کی حیثیت سے نہیں بلکہ مستقل ایڈیٹر کی حیثیت سے نکل رہا تھا۔ بہر صورت ہم کو آم کھانے سے غرض تھی۔ پیڑ گننے سے کیا واسطہ۔ ہم نے کام شروع کر دیا۔ ہمدم والی "دو دو باتوں" کو اس اخبار میں شروع کیا۔ اور اپنے ذمہ اس مزاحیہ کالم کے علاوہ پورا ایڈیٹوریل کا صفحہ لے لیا۔ کبھی سید نور الحسن لیڈر لکھتے تھے۔ اور ہم شذرات اور دو دو باتیں کبھی وہ شذرات لکھتے تھے۔ اور ہم لیڈر اور دو دو باتیں۔ دراصل اس وقت اس اخبار کی حیثیت اخبار کی تھی ہی نہیں۔ بلکہ مالکان اخبار کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ منشی نولکشور صاحب آنجہانی نے اس اخبار کو جاری کیا تھا۔ لہٰذا یہ سرنامہ ان کی تصویر کے ساتھ نکلتا رہے جس طرح بھی نکلے۔ البتہ چونکہ بہت پرانا اخبار تھا۔ لہٰذا دوائی کمپنیوں کے اشتہارات

اِس کے پاس بہت کافی تھے۔ مگر پھر بھی غالباً خسارہ میں چل رہا تھا۔ ہم نے اس اخبار کے دفتر میں کام کر کے یہ تماشہ دیکھا۔ کہ جس کا جب وقت جی چاہا چلا آیا۔ اور جو جی چاہا کام کیا۔ کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ خود ایڈیٹر صاحب اِس قدر کم سخن تھے کہ کسی سے کچھ کہہ ہی نہ سکتے تھے عملۂ ادارت والے یہ کرتے تھے کہ قلم سے زیادہ قینچی سے کام لیا جاتا تھا۔ اِس اخبار سے ایک خبر کاٹی اس اخبار سے ایک مضمون لیا۔ کاتب نے زیادہ تقاضا کیا تو کسی اخبار پر پنسل سے نشان بنا دیا۔ اور لیجئے اخبار تیار تھا۔ صرف ایڈیٹوریل والا صفحہ ایسا ہوتا تھا۔ جسے لکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اور کبھی کبھی کچھ خبروں کے ترجمے بھی کر لیے جاتے تھے۔ تب نورالحسن صاحب سے کچھ ہی دنوں میں نہایت بے تکلفی ہو گئی۔ ایسی بے تکلفی کہ اب یہاں بھی کلب کی سی فضائیں پیدا ہونے لگیں۔ ایک قسم کا پنچ ہم لوگوں نے ایجاد کیا جو روزانہ گیارہ بجے کھایا جاتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ عملۂ ادارت کے چار ممبروں میں سے جو صاحب سب کے بعد آتے تھے وہ ایک روپیہ کی مٹھائی منگایا کرتے تھے۔ یہ تو ظاہر ہی ہے۔ کہ مختلف مقامات سے آنے والے سب ایک ساتھ دفتر میں پہنچ نہیں سکتے تھے۔ کوئی نہ کوئی دیر میں پہنچتا ہی تھا۔ دیر کی مراد دفتر کی حاضری کے وقت سے نہیں۔ بلکہ یوں بھی جو دیر میں آئے۔ وہی اس دن کے پنچ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا۔ کہ دو ممبر ایک ہی دم سے ساتھ ساتھ پہنچے اور دروازے سے لے کر دفتر کے کمرے تک ان دونوں میں دوڑ ہو گئی

یہ لبا سول سروس کیپ کے گھوڑے دوڑیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دفتر کی
حاضری کے مقررہ وقت سے پہلے ہی ہم لوگ پہنچنے کی کوشش کرتے تھے
اور جب بھی پہنچتے تھے۔ بلدیو پرشاد کھرے نامی ایک بزرگ تھے ——
ان کو ہمیشہ موجود پاتے تھے۔ اس سلسلہ میں کبھی ایک دن کا جرمانہ بھی ان پہ نہیں ہوا
معلوم نہیں وہ رات کو بھی دفتر ہی میں سوتے تھے یا کیا۔ باقی رہ گئے تین ممبر۔ ان میں سب
سے زیادہ جرمانے سید نور الحسن صاحب خود ادا کرتے تھے۔ حالانکہ فاصلہ سب سے
زیادہ ہم کو طے کرنا پڑتا تھا۔ یعنی ہم وکٹوریہ اسٹریٹ سے حضرت گنج پہنچتے تھے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد معلوم یہ ہوا کہ مستقل ایڈیٹر صاحب جیل سے واپس
آ رہے ہیں سید نور الحسن صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور ہم کو قائم مقامی کرنا
پڑی۔ اب ہم اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ اسی زمانہ میں منشی بشن نرائن صاحب
کا انتقال ہو گیا۔ جو نول کشور اسٹیٹ کے مالک تھے۔ اور تمام اسٹیٹ مع اخبار
کے کورٹ آف وارڈس میں چلا گیا۔ اس لیے کہ نئے مالک کے بالغ ہونے
میں کچھ عرصہ تھا۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل سے آنے کے باوجود یہ ایڈیٹر
صاحب اخبار کی ادارت پہ واپس نہ آ سکے۔ اور ہم خوش تھے کہ ہمارا نام اس جگہ
نکل رہا ہے جہاں اب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار ایسے بزرگوں کا نام نکل
چکا ہے مگر ہم میں ایک خرابی تھی کہ ہم نہ تو کبھی پنڈت بشن نرائن بھارگو آنجہانی
سے ملے تھے۔ اور نہ نول کشور اسٹیٹ کے کسی اور ذمہ دار سے ملنے کی کبھی

کوشش کی تھی۔ اور نہ اب کورٹ آف وارڈس کے اُن افسران سے ملنے کی کوشش کرتے تھے جو ہماری قسمت کے گویا ذمہ وار بن چکے تھے۔ لہٰذا ہم اندر ہی اندر ایک کھچڑی پکی۔ اور ایک اور صاحب کو اخبار کی ادارت پر بلا کر ہم کو بدستور اسسٹنٹ ایڈیٹری پر واپس کر دیا گیا۔ ہم اس پر بھی بددل نہیں ہوئے اس لیے کہ اتنے دنوں تک اخبار کو سنبھالنے کا ہم کو کوئی مزید معاوضہ نہیں ملا تھا جو تنخواہ ملتی تھی وہی ملتی رہی۔ ایک صاحب نے یہ بات بالکل سچی کہی تھی۔ نول کشور اسٹیٹ کی ملازمت تو گویا ایک قسم کی پنشن ہے جو ہمیشہ ملتی رہتی ہے۔ نہ کام کی کوئی خاص پوچھ گچھ ہوتی ہے نہ برطرفی کا کبھی کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ کیا ہم زندگی بھر اسی تنخواہ پر ہمیشہ رہنے کے لیے مجبور تھے۔

موجِ تبسّم

نسیم صاحب نے ہمارے مضامین کا پہلا مجموعہ "موجِ تبسّم" کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ گویا ہماری پہلی کتاب تھی۔ اور مصنّف بننے کے شوق میں ہم بھوک پیاس بھولے ہوئے تھے۔ کتابت کے دوران میں کاتب کا گویا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ طباعت کے وقت پریس میں نظر آتے تھے۔ کاپیاں دیکھتے تھے۔ پروف پڑھتے تھے۔ اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح آج ہی کتاب ہاتھ میں آجائے۔ خدا خدا کر کے کتاب تیار ہوئی۔ اور اب نسیم صاحب نے کہا

کہ چلو اس کتاب کو لے کر نینی تال دہلی اور لاہور وغیرہ کا سفر کر آئیں۔ سب سے پہلے ہم لوگ بھوالی ضلع نینی تال پہنچے۔ جہاں برادر محترم ڈاکٹر محمد زبیر صاحب اُس وقت ملازم نہ تھے۔ بلکہ دق کے مریض کی حیثیت سے مقیم تھے۔ اور اب دق کے مریضوں کے اسی سنی ٹوریم میں معالج ہیں۔ بھوالی میں موجِ تبسم کی کافی اشاعت ہوئی۔ جتنے خریدار اس چھوٹی سی جگہ میں ہم کو ملے۔ ہم اس کو بہت سمجھتے تھے۔ بھوالی سے پیدل ہی نینی تال کا سفر کیا۔ اور اس سفر میں نسیم صاحب اس قدر خستہ و خراب ہوئے۔ کہ ان کو واپسی میں اپنے متعلق یہ شبہ ہو گیا تھا کہ شاید قد کچھ چھوٹا ہو گیا ہے یعنی پیر کچھ گھس گئے ہیں۔ بھوالی اور نینی تال کے اس سفر کے بعد ہم دونوں دہلی پہنچے۔ اور تاج محل نامی ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی دن احباب سے ملے۔ اور آخر اکبر حیدری مرحوم نے ہم دونوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ اسی دن نیرنگ خیال کے ایڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب اور اسسٹنٹ ایڈیٹر حنیف ہاشمی مرحوم ان کے یہاں مدعو تھے۔ کھانے پر برادرم عشرت رحمانی صاحب بھی تھے۔ باتوں ہی باتوں میں نسیم انہونوی میں اور حکیم یوسف حسن میں کچھ یوپی اور پنجاب کی بحث چھڑ گئی جس نے نہایت ناگوار طول کھینچ لیا۔ اور آخر ہم کو اور اکبر حیدری مرحوم کو اس بحث میں پڑ کر اُسے ختم کرانا پڑا۔ مگر نسیم اس قدر ناراض ہوئے کہ پنجاب جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ ہم لوگ صبح ہوٹل میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ نے یہ پرچہ دیکھا ہے

اور جو اب مانگا ہے۔ یہ پرچہ وہاں کے ایک زنانہ رسالہ کی ایڈیٹرس صاحبہ کی طرف سے تھا۔ جنہوں نے ہم کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا تھا چنانچہ ہم لوگ پہنچے اور گو وہ خود پردے میں رہیں مگر ان سے کافی تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ آخر جب ہم واپس آنے لگے تو ہم سے رسالہ کے لیے ایک مضمون کا وعدہ لیا گیا۔ جسے ہم نے ہوٹل پہنچ کر رات ہی میں ختم کر دیا۔ اس لیے کہ ایک خاتون کا مطالبہ تھا اور صبح وہ مضمون ان کو بھجوا دیا۔ وہاں کے اس سفر میں موج تبسم اور حریم کے لیے کافی کام ہم لوگوں نے کیا۔ اور خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

اخبار سرپنچ کا اجراء

نسیم صاحب رسالہ انکشاف سے علیحدہ ہو کر ایک زنانہ رسالہ حریم کے نام سے نکال رہے تھے۔ جو اب تک نکل رہا ہے۔ اس رسالہ کے عملۂ ادارت میں شوکت تھانوی کا نام بھی تھا۔ اور رسالہ میں ہم برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ نسیم صاحب سے بے تکلفانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ وہ کسی طرح برادرانہ تعلقات سے کم نہ تھے۔ بلکہ بھائی تو خیر حضرت یوسف کے بھی تھے۔ مگر نسیم ایسے دوست کم ہوتے ہیں۔ اب گویا ہمارے دوستوں میں امین سلونوی اور نسیم انہونوی ہی یا دو ایسے تھے جن پر ہر طرح پورا بھروسہ ہو سکتا تھا۔ ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ساتھ رہتے تھے۔ اور ہر ہنگامے میں تینوں باپ بیٹا روح القدس کی طرح ساتھ ساتھ شرکت کرتے

ایک دن ہم تینوں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ ایک ہفتہ وار خالص مزاحیہ اخبار نکالا جائے۔ تسنیم صاحب نے فوراً اپنے چہرہ پہ تجارتی تجربے کے آثار پیدا کیے۔ امین نے نتھنے پھلا کر اپنے رسالہ نظر کے تجربہ کو اجاگر کرنا چاہا۔ اور اتنی دیر میں ہم نے اخبار کا نام سرپنچ تجویز کر دیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں امین آباد پارک کے سبزہ زار پر بیٹھے ہی بیٹھے پوری اسکیم تیار ہو گئی۔ یعنی دو ہی تین دن کے اندر ڈکلریشن داخل کر دیا گیا۔ اور طے یہ پایا کہ ہم کو زرد کوٹھی سے اٹھ کر امین آباد ہی کے کسی حصہ میں آ جانا چاہیے۔ اس لیے کہ اتنی دور رہنا۔ ادھر اخبار کی ملازمت کرنا۔ اور پھر سرپنچ کی ادارت کرنا یہ سب آسان نہ رہے گا؟ رائے معقول تھی لہٰذا ہم نے والدہ صاحبہ سے اجازت لی۔ بیوی کی انگلی پکڑی۔ ایک بچہ یعنی میاں سعید عمر کو بھی جو ابھی چند ماہ کے تھے ساتھ لیا۔ اور لاٹوش روڈ کے ایک مکان میں آ گئے۔ جو اندر سے ہمارا مکان تھا۔ اور باہر سے اخبار سرپنچ کا دفتر۔ اب بیگم صاحبہ کے سر بھی گھرداری آ پڑی تھی۔ ہم نے آج تک سب کچھ کیا تھا۔ لیکن نون تیل۔ لکڑی کی فکر کبھی نہ کی تھی اور اب ذرا پریشان تھے۔ کہ کیا کریں گے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری بیوی کا۔ اس نے ہم کو اس فکر میں آج تک مبتلا نہیں ہونے دیا چنانچہ ہم کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ کہ آٹے کا کیا بھاؤ ہے۔ لکڑی کس حساب آتی ہے۔ گوشت کتنے سیر ہے۔ بیگم صاحبہ دھمکاتی ضرور رہیں۔ کہ یہ سب باتیں آپ کو جاننا چاہئیں۔ مگر یہ دھمکی عملی صورت کبھی اختیار نہیں کرتی۔ اس ذرا سے مکان بدلنے ہی میں بدحواسی کا عالم

یہ تھا۔ کہ گویا شہر کے ایک محلہ سے دوسرے محلہ نہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ ولایت کا سفر درپیش ہے۔ حالانکہ یہ کام سب دوسرے لوگوں نے کیا تھا۔ اور ہم صرف یہ کہہ کر چلے آئے تھے بیگم سے کہ شام کو نئے گھر میں ملاقات ہوگی۔ مگر اللہ اکبر وہ اہتمام تھا اور وہ ذمہ داری محسوس ہو رہی تھی۔ کہ گویا نہ جانے کتنی بڑی مصیبت پڑ گئی ہے۔ گھر کا تمام انتظام بیگم نے درست کر لیا۔ اور ادھر ستمبر ۱۹۳۱ء میں ہم ارباب ثلاثہ کا اخبار سرپنچ نہایت شاندار طریقہ پر بہت ہی خوبصورت سرورق کے ساتھ نکلا۔ پرچہ دو قسم کا چھاپا گیا۔ ایک عام ایڈیشن "غریبا مئو" اور دوسرا اعلیٰ ایڈیشن "امیرا مئو" یہ ان دونوں ایڈیشنوں کے نام تھے۔ غریبا مئو تو سب نے سنا ہوگا مگر امیرا مئو سرپنچ کی ایجاد تھی۔ جو آج تک قائم ہے۔ سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے ہمارا نام تھا اسسٹنٹ ایڈیٹر امین سلونوی۔ اور مینیجنگ پروپرائٹر نسیم انہونوی۔ پہلا ہی پرچہ بازار میں آیا تھا کہ لوگوں کو دوسرے اور پھر تیسرے اور آخر ہر نمبر کا مسلسل انتظار رہنے لگا۔ نئے نئے کالم اس میں جاری کیے تمام اطراف ملک کے مزاح نگاروں سے بہتر سے بہتر مضامین لکھوائے۔ نئے نئے مزاح نگار پیدا کیے۔ اور کچھ ہی دنوں میں سرپنچ نے اپنا ایک خاص حلقہ بنا لیا۔ اور خریداروں کی تعداد میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس اخبار کی ایک خاص وقعت اخبار برادری میں بھی قائم ہو گئی۔ اس کے مضامین معاصرین نے نقل کرنا شروع کر دیئے اور اس کے تبصروں سے بڑے بڑے سورما جو کتے رہنے لگے۔ کہ معلوم نہیں

کب کس کی کس رنگ میں خبر سے مل جائے۔

خورشید عمر

سعید عمر بڑا بچہ پونے دو سال کا تھا کہ دوسرے صاحب خورشید عمر تشریف لے آئے۔ سعید کا رنگ سانولا تھا۔ مگر یہ بچہ نہایت سُرخ و سپید پیدا ہوا۔ بلکہ جب میری بہن خاتونِ ارشد صاحب اس کو لے کر مجھے دکھانے لائیں۔ تو میں سمجھا یہ مجھ سے مذاق ہو رہا ہے۔ کسی اور کا بچہ لے کر آگئی ہیں۔ بھلا میرے یہاں ایسا حسین بچہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ مگر بعد میں اس بچے نے اور بھی ہاتھ پیر نکالے۔ خوب موٹا تازہ اور نہایت شگفتہ ہو گیا۔ مگر میں سعید کو زیادہ چاہتا تھا۔ اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا۔ کہ سعید کی دل شکنی ہو گی۔ اگر اس کے ساتھ کسی کو چاہا جائے گا۔ بلکہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو ممکن ہے کہ اس کو یہ خیال بھی آنے لگے۔ کہ خورشید کو اس لیے چاہا جاتا ہے کہ وہ خوبصورت ہے۔ میں اپنے سانولے سعید کو بددل کرنا نہ چاہتا تھا مگر یہ حضرت خورشید خود ہی مجھ سے بہت زیادہ لپٹنے لگے۔ اور آخر رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کسی وقت وہ مجھ سے علیحدہ ہی نہ ہونا چاہتے تھے۔ اب بھی سعید اور خورشید میں رنگ کا وہی فرق موجود ہے۔ مگر سعید نہایت متین اور سنجیدہ ہیں اور خورشید نہایت طرار اور بزلہ سنج۔ سعید کو پڑھنے کا زیادہ شوق ہے۔ اور خورشید عام دلچسپیوں میں اپنے کو ہمیشہ مصروف رکھتے ہیں۔

ایک مشاعرے کی صدارت

جھانسی میں ایک مشاعرہ بہت بڑے پیمانہ پر منعقد کیا گیا۔ اور اس کی صدارت کے لیے ہم کو وہاں سے طلب کیا گیا۔ اب ہمیں یہ فکر کہ یا اللہ یہ صدارت کیونکر ہو سکے گی ہم سے غزل پڑھ دینا دوسری بات ہے حلقۂ احباب میں جھپک لینا دوسری چیز ہے مگر مشاعرہ کا خطبۂ صدارت کیسے پڑھیں گے معلوم نہیں کتنا مجمع ہو کیسے کیسے شاعر ہوں۔ انتظام تو بڑے پیمانے پر نظر آتے ہیں۔ شاندار بات تو یہ ہے کہ زبانی کچھ اس طرح بول دیں۔ کہ لوگوں کو یہ خیال گزرے کہ برجستہ کچھ کہہ دیا ہے۔ مگر یہاں اس کی عادت ہی نہ تھی۔ آخر طے کیا کہ خطبۂ صدارت تو لکھا ہوا ہوتا ہی ہے لکھ کر کیوں نہ لے جائیں۔ چنانچہ ایک خطبہ لکھا اور پڑھنے کے کئی ریہرسل کیے۔ اور آخر مقررہ تاریخ پر پہنچنے کے لیے جھانسی روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ جھانسی کے اسٹیشن پر لوگ سب لینے آئیں گے۔ لہٰذا ہم پہلے ہی سے بنے سنورے کچھ صدر منتخب بنے ہوئے پلیٹ فارم پر اترے۔ مشاعرے کے کچھ رضاکار ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ ہر ڈبہ میں جھانک رہے تھے۔ مگر ہم سے کوئی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ آخر بڑی دیر کے بعد ایک رضاکار صاحب نے ہمارے پاس آ کر دریافت کیا۔

"کیا آپ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں؟"

عرض کیا۔ "جی ہاں"

فرمایا "ہم اِس ٹرین سے شوکت تھانوی صاحب تشریف لانے والے تھے
ان کو تو آپ نے نہیں دیکھا؟"

عرض کیا "میں اُن ہی کا لڑکا ہوں۔ والد صاحب تشریف لانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ کہ کل صبح ہی فالج کا نہایت سخت حملہ ہوا۔ اور آخر مجھ کو حکم دیا کہ تم میرا خطبۂ صدارت لے کر چلے جاؤ۔"

سب رضاکار اس وقت ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ اور اس حادثہ کا سب ہی کو افسوس تھا۔ مجبوراً شوکت تھانوی صاحب کے بجائے ان کے صاحبزادے کو لے کر سب چلے۔ کہ اتنے میں برادرم حامد صاحب شاہجہانپوری "شوکت بھائی شوکت بھائی" چیختے دوڑتے ہوئے آئے۔ اور ہم سے بغلگیر ہو گئے۔ ہم نے ان کو یہ لطیفہ سُنا کر کہا کہ بیچارے اس ٹرین پر شوکت تھانوی کی مناسبت سے مولانا شوکت علی کی قسم کا ایک بھاری بھرکم کوئی شوکت تھانوی تلاش کر رہے تھے۔ اگر میں ان سے کہتا کہ میں ہی شوکت تھانوی ہوں تو ان کو ہرگز یقین نہ آتا یا اگر یقین آتا تو بے حد مایوس ہوتے۔ شوکت تھانوی پر فالج کے حملے سے بھی زیادہ مایوس۔ آپ کو چاہیے تھا۔ کہ اتنا بڑا مشاعرہ کیا تھا تو اتنا ہی بڑا صدر بھی چنا ہوتا۔ ایک سوکھا سہما فاقہ زدہ صدر چن کر آپ نے یہ لطیفہ پیدا کیا ہے۔ اس قصہ کا مشاعرے کے آخر تک چرچا رہا۔ مشاعرے میں کچھ نہ پوچھیے کہ خطبۂ صدارت کس طرح پڑھا ہے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ خود اپنی پھانسی کا حکم نامہ خود

اپنے کو سنا رہے ہیں۔ ایک تو جھانسی کی گرمی اس پر نیا نویلا صدرہ، تمام جسم سے پسینہ کا ایک دریا رواں تھا۔ شروع شروع میں کاغذ کے حروف بھی نظر نہ آرہے تھے دونوں پیر اگر دشمن اور دونوں ہاتھ پورب پچھم کانپ رہے تھے۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ پہلے تو خیر لطیفہ کے طور پر فالج گرا تھا مگر اس وقت ہم خود فالج بن کر گرنے ہی والے ہیں کسی کے اوپر۔ مگر حاضرین نے ایک آدھ فقرے پر تالیاں بجائیں۔ اور ایک آدھ جگہ لوگ ہنسے تو یہ ارتعاش ختم ہوا۔ اور آخر خطبۂ صدارت جو ہم نے اپنی عقلمندی سے نہ جانے کیوں ذرا طویل لکھ لیا تھا ختم ہو گیا۔ جان بچی لاکھوں پائے —— یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم کو یہ معلوم ہوتا کہ صدارت کا اعزاز ہمارے لیے اس قدر گراں ثابت ہوگا۔ اور ہماری جان پر اس طرح بن جائے گی۔ تو دور ہی سے سات سلام کرتے۔ اور بانیانِ مشاعرہ سے کہہ دیتے کہ ہماری مصروفیات ہم کو اجازت نہیں دیتیں کہ ہم مقررہ تاریخ پر آپ کے مشاعرے کی صدارت کریں۔ یہ طریقہ بھی حکماء نے بڑا آدمی بننے کے لیے مجرب بتایا ہے۔

رفیع احمد خاں

ان حضرت کو اکثر شاعروں میں صفِ سامعین کی زینت بنے ہم پہلے ہی دیکھ چکے تھے اس کے علاوہ امین سلونوی صاحب کے رسالہ نظر کے ایڈیٹوریل بورڈ میں آپ کا نام نامی اسم گرامی تھا۔ مگر اب تک آپ سے براہِ راست ملاقات نہ تھی۔ اتفاق

سے اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے سے جو بلاوجہ طویل ہوتا چلا جا رہا تھا دو تین آدمی چپکے سے فرار ہوئے۔ ان میں ایک یہ خاکسار اور دوسرے رفیع احمد خان صاحب تھے۔ ہم تو چپکے سے بھاگے تھے۔ اس کی تو وجہ یہ تھی کہ ہم غزل پڑھ چکے تھے۔ اور اخلاقاً اب آخر مشاعرہ تک ہم کو ٹھہر کر دوسروں کا کلام سننا چاہیئے تھا مگر ہم حیران تھے کہ یہ حضرت تو محض سامع تھے یہ اس قدر کیوں چھپ کر جا رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ کو ایک شاعر صاحب بہ جد اصرار کر کے لائے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کا مقصد یہ ہوگا کہ خان صاحب ان کی مشاعرے کی شرکت بھی دیکھیں۔ اور غزل سن کر داد دیں۔ مگر چونکہ ان کے پڑھنے میں کافی دیر تھی۔ لہٰذا آپ ان سے آنکھ بچا کر فرار ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں کو اب یہ فکر تھی کہ کسی طرح کوئی سواری مل جائے تو گھر تک پہنچ جائیں۔ اس مشاعرے کی صدارت متین الدین صاحب ایڈووکیٹ مرحوم کر رہے تھے۔ یکایک خان صاحب نے دیکھا۔ ان کا کار غالباً ان کو واپس لے جانے کے لیے آ رہا تھا۔ بیچ سڑک پر دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور نے کار روک لیا۔ تو آپ نے پوچھا "متین صاحب کی گاڑی ہے نا" اس نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے "فوراً چلو امین آباد۔ اور ہم سے کہا "متین صاحب نے اندازہ تو بالکل ٹھیک لگایا تھا کہ راستہ میں گاڑی مل جائے گی" ڈرائیور نے اب کوئی بھی سوال نہ کیا۔ اور ہم دونوں کو کار میں بٹھا کر امین آباد لے آیا۔ خان صاحب معلوم نہیں کیا کہنے والے تھے کہ ہم نے ڈرائیور

سے کہا۔ "اچھا اب جاؤ اور کہہ دینا کہ دکان بند تھی۔" ڈرائیور بیچارہ چپکا چلا گیا۔ تو خان صاحب نے ہنسی سے بے قرار ہو کر کہا۔ "یہ آخری ٹکڑا قسم خدا کی حاصلِ مشاعرہ ہے کہ کہہ دینا دکان بند تھی؟ اس وقت چار بجے رات کو دکان کے بند ہونے کی وہ لاجواب رہی ہے کہ میں صاحب بھی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔" اس ملاقات کے بعد سے اور اس مشترکہ شرارت کے بعد ہمیشہ محسوس ہوا کہ ہم دونوں کی زندگی علیحدہ علیحدہ نہایت قطعاً مہمل ہے۔ اور اس وقت تک کوئی مفہوم ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک یہ دونوں مصرعے ساتھ پیش نہ ہوں پھر خانصاحب نے اپنی کسی دلچسپی میں ہم کو اور ہم نے کسی سرگرمی میں خانصاحب کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ہر چند کہ خانصاحب کے مشاغل کچھ ایسے بھی تھے جن سے ہم کو کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکتی تھی مگر خانصاحب چاہتے یہ تھے کہ ان کے وہ مشاغل بھی ترک نہ ہوں۔ اور ہم بھی ان کے ساتھ رہیں۔ ہم نے اب تک اتنا ذہین، اتنا برجستہ اور ایسا قابل آدمی نہیں دیکھا تھا۔ قابلیت سے خان صاحب نے کبھی کوئی فائدہ خود تو نہیں اٹھایا، مگر ان کی قابلیت سے دوسرے ہمیشہ فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ آپ کے عجیب و غریب مشاغل تھے۔ مثلاً آندھی آئے یا پانی برسے، طوفان آئے یا قیامت برپا ہو جائے۔ آپ کے لیے شام کے وقت چوک جانا دفتر کی حاضری سے زیادہ ضروری تھا۔ ایک دفعہ کہا تم بھی چلو۔ ہم اس چوک سے بالکل واقف نہ تھے۔ ایک وحشت سی ہمیشہ ہوتی

تھی۔ مگر رفیع احمد خاں کی جادوگری میں بھی بنگال کی جادوگرنیوں سے کچھ کم کمال نہ تھا وہ کسی زمانہ میں آدمی کو بیل بنا کر کھونٹے سے باندھ دیا کرتی تھیں۔ خاں صاحب نے اپنے جادو کے زور سے ہم کو بھی اپنی قسم کا جانور بنا کر رکھ دیا تھا۔ اور ہم ان کے ساتھ بلاناغہ چوک جانے لگے تھے۔ بغیر کسی دلچسپی کے ان کو چوک کی مخلوق سے دلچسپی تھی اور ہم کو ان سے، ان کی ذہانت سے اور ان کی باغ و بہار افتادِ طبیعت سے۔ ان کے چوک کے دوستوں کا حلقہ بھی دوسرا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ خاں صاحب کے ان سے بڑھ کر دوست اور کہیں نہیں ہیں، جس کو دیکھئے وہ خاں صاحب سے واقف جس کو دیکھئے وہ خاں صاحب کو گھیرے ہوئے اور سب کو حیرت کہ خاں صاحب کے ساتھ یہ نیا جانور کون سا ہے۔

ایک شدید امتحان

رفیع احمد خاں کو ایک ضد یہ تھی ان کے دوستوں میں یہ دعویٰ کوئی کیوں کرے کہ میں بڑا پارسا ہوں۔ وہ اس کبڑی بڑھیا کے مانند تھے۔ جو دعا کرتی تھی کہ خدا کرے ساری دنیا کبڑی ہو جائے۔ چنانچہ رفیع احمد خاں صاحب نے ہم کو بھی ایک ایسے بالاخانہ پر پہنچا دیا۔ جہاں ایک نہایت ہی معقول قسم کی صاحبزادی اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھیں۔ خاں صاحب کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور معلوم یہ ہوا کہ آپ کے لیے یہ جگہ نئی نہیں ہے۔ قصہ در اصل یہ ہے کہ خاں صاحب

کسی جگہ کو اپنے لیے نئی نہ رہنے دیتے تھے۔ چوری تو خیر صرف ایک ہی جگہ کرتے تھے۔ مگر ہیرا پھیری کے لیے تمام چوک پڑا ہوا تھا۔ بہر صورت اس جگہ ہم خان صاحب کے ساتھ پہلی مرتبہ آ گئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد خان صاحب نے کیرم بورڈ اپنی طرف گھسیٹ کر ایک بازی کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑی بہن اور خان صاحب پارٹنر ہو گئے۔ ہم اور چھوٹی بہن پارٹنر بنے۔ ان سب میں سب سے اچھا کیرم ہم کھیلتے تھے۔ اس لیے کہ مشق بڑھی ہوئی تھی۔ اور آج کل مگر پر روزانہ کیرم ہوا کرتا تھا۔ اب چھوٹی بہن نے کھیل کے جوش میں شاباش سے پارٹنر۔ کیا کہنا ہے پارٹنر وغیرہ کہہ کہہ کر براہ راست ہم کو مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ اور آخر میں جب ہم جیت گئے۔ تو بھی یہی کہا۔ اب جس کا جی چاہے ہم سے کوئی بڑی سے بڑی شرط لگا کر کھیل لے۔ خان صاحب نے دوسرے دن کے لیے باقاعدہ میچ طے کر لیا۔ اور کچھ مٹھائی وغیرہ کی شرط بھی ہو گئی۔ اسی طرح اب روز میچ ہونے لگے۔ اور روز ہم کو خان صاحب کے ساتھ وہاں جانا پڑا۔ ہمارے اور خان صاحب کے علاوہ مرزا صاحب بھی جاتے تھے جن کا پورا نام اس موقع پر اس لیے لکھنا مناسب نہیں ہے کہ ممکن ہے مرزا صاحب اس کو اپنے لیے مناسب نہ سمجھیں۔ ہمارا کیا ہے ہم تو اوکھلی میں سر ڈال ہی چکے ہیں۔ اس روز کے پھیروں کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ ہماری پارٹنر نے نہ ناک لانا شروع کر دیئے۔ کچھ عجب لگاوٹ کی باتیں عجیب عجیب مطالبات

مثلاً یہ کہ ہم مرزا صاحب اور خان صاحب کے ساتھ آنے کی بجائے تنہا بھی آیا کریں۔ ہم اگر کسی روز نہ گئے تو دوسرے دن خان صاحب نے ان کی شکایت تک پہنچا دی۔ اور اب ہم پر زور دیا جا رہا ہے کہ چلو میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں کہ کل ضرور تمہارے پارٹنر کو لے کر آؤں گا۔ ہم اس خطرہ سے آگاہ ہو چکے تھے اور اب ہم رسیاں تڑا رہے تھے۔ ادھر خان صاحب ہماری اس کیفیت سے مایوس ہوتے جاتے تھے۔ مرزا صاحب ادھر کے پیغامات لاتے تھے اور عجیب عجیب باتیں روز آ کر سنایا کرتے تھے۔ کہ بھئی تم کیوں اس کی جان کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ کل بھی جب ہم لوگوں کے ساتھ تم کو اس نے نہ دیکھا تو بیچاری کے آنسو نکل پڑے۔ حد یہ ہے کہ اس کی بڑی بہن تک کہہ چکی ہے کہ یہ ایسی ہی بے قرار ہے تو اپنی ذمہ دار خود ہے اور وہ اگر کسی تجارتی خیال کے ماتحت یا کسی اقتصادی مشکل کی وجہ سے نہیں آتے تو ان سے کہہ دیجئے کہ شوق سے آئیں روپیہ پیسے کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ مگر ہم نے نہ تو خان صاحب کا اس سلسلہ میں کہنا سنا۔ اور نہ مرزا صاحب کی کوئی بات مانی۔ خدا کو بچانا تھا اس نے ہم کو بچا لیا۔ اور ہم اس امتحان میں بفضلہ کامیاب رہے۔

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی،

اس امتحان میں تو کامیاب ہو گئے مگر ایک دوسرا امتحان سر پر آ گیا۔ یعنی

وہی صاحبہ جو دہلی میں ہم کو وحشت دے چکی تھیں۔ لکھنؤ تشریف لاکر ایک سرائے
میں ٹھہر گئیں۔ اب ہم نے یہ سوچا کہ ایک شریف گھرانے کی خاتون کا اس طرح
ہمارے شہر میں آکر ایک سرائے میں ٹھہر جانا کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا
چنانچہ ہم نے ان کے بھائی صاحب سے کہا۔ کہ آپ اپنی ہمشیرہ کو یہاں لے
آئیے۔ میں اپنی بیوی سے ان کو ملا دوں گا۔ اور وہ یہاں آرام سے رہ سکیں گی۔
تھوڑی ہی دیر میں وہ ہمارے یہاں آگئیں۔ چونکہ پردہ کرتی تھیں لہٰذا ہم نے اپنی بیوی
سے کہہ دیا کہ آپ ان کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کیجئے۔ ان کے بھائی
صاحب کی مدارات میں کروں گا۔ اب وہ ہمارے یہاں مہمان ہو گئیں۔ ایک
ہفتہ۔ دو ہفتے۔ تین ہفتے۔ ایک مہینہ۔ دو مہینے۔ تین مہینے۔ اور ایک دن
یہ کہہ کر کہ جب میں بھائی صاحب کہتی ہوں۔ تو پردہ کیسا۔ سامنے آگئیں۔ نہایت
حسین و جمیل۔ نہایت تمیزدار اور نہایت خوش مذاق ہم پر یا بیوی پر ان کا اس قدر جم
کر رہنا ہرگز بار نہ تھا۔ مگر بیوی غریب گرفتار ہو کر رہ گئی تھیں نہ کہیں آسکیں نہ جا سکیں مہمان
کو گھر پر کیسے چھوڑ دیا جائے۔ آخر ایک ضرورت سے ان کو والدہ صاحبہ کے
پاس زرد کوٹھی جانا پڑا۔ مگر ہم بھی ان کے ساتھ گئے۔ اور ان محترمہ کے سپرد گھر کی
چابیاں کر دی گئیں۔ کہ لیجئے آپ جانیں آپ کا کام جانے رات کو تو خیر زرد کوٹھی
میں بیوی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ مگر دن کو سرپنچ کے دفتر کی وجہ سے اس گھر
میں بھی آنا پڑتا تھا۔ اور یہی آنا جانا آخر ایک دن ہم کو لے ڈوبا۔ ادھر سے پسندیدہ

نظریں۔ اُدھر سے ان نظروں کی پذیرائی، شیطان نے ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر اس زور سے بھینچا۔ کہ دونوں ایک ہو گئے۔

احساسِ شکست

ہم ڈوب چکے تھے۔ پانی سر سے گزر چکا تھا، مگر اس گناہ کے بعد ہی آنکھیں کُھل گئیں۔ سب سے پہلے اپنی اس معصوم بیوی کا خیال آیا۔ جس کی ہم نے خیانت کی تھی۔ اور جو ہم پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتی تھی۔ جس نے آج تک کبھی ہم پر شک نہ کیا تھا۔ اور جس کے اعتماد کو آج ہم نے اس بُری طرح پامال کیا تھا۔ گناہ کی لذت کے بعد احساسِ گناہ کی بے کیفی ہم کو مارے ڈالتی تھی اور ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ ہم کس طرح اس بوجھ سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ آخر ہم نے ایک قطعی فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ پر غور کیا۔ اور نتائج سے قطعاً بے فکر ہو کر ہم نے ایک اقراری مجرم کی طرح اپنے کو بیوی کے سامنے پیش کر دیا۔ بیوی کے پاس پہنچ کر ہم اس قدر روئے کہ وہ بیچاری بھی پریشان ہو گئی اور رو رو کر ہم نے تمام قصہ من و عن بیان کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس غریب کے دل کو ایک دھچکا لگا ہو گا۔ مگر اس نے ہم کو مطمئن کرتے ہوئے کہا کہ آپ یقین کیجئے کہ آپ کی جو قدر و منزلت میری نظروں میں اب تک تھی آج اس سے دوبالا ہو گئی۔ آپ نے گناہ ضرور کیا ہے۔ مگر جس طرح آپ اپنے اس گناہ کا اعتراف اور اقبال کر رہے ہیں۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب

تک آپ میں وہ تمام خصوصیت موجود ہے جو اس قسم کا گناہ کرنے کے بعد پاش پاش ہو جانا چاہئیے تھی۔ بیوی سے بیان کر چکنے کے بعد اور اپنے گناہ کی تھوڑی بہت سزا خود اپنے کو دے کر ہم مطمئن ہو گئے۔ ہم ان صاحبہ کا نام لکھنے کا حق اب بھی نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ حالات ہم اپنے لکھ رہے ہیں۔ ان کو بے نقاب کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ وہ اب نہایت خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہوں گی۔ ہم ان کے پھولوں میں پڑ کر کانٹے بننا نہیں چاہتے۔

تاش اور بازیاں

رفیع احمد خان صاحب کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ تاش کھیلنا بھی تھا۔ وہ روپے لگا کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ کبھی فلش کبھی برج کبھی نیپ کبھی کٹی اور ساتھ میں رمی۔ ہم تاشوں کے کھیل میں اب تک سوائے غلام چور کے کوئی کھیل نہ جانتے تھے۔ چانس کبھی آتی تھی مگر بھول سے گئے تھے مگر چونکہ خانصاحب کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ لہٰذا وہ کھیلا کرتے تھے۔ اور ہم بیٹھے دیکھا کرتے تھے۔ ہم سے جب کبھی کھیلنے کے لیے کہا۔ ہم نے ہمیشہ یہی کہا کہ بخشئیے اس خاکسار کو مگر رفتہ رفتہ کھیل اس قدر سمجھ گئے تھے کہ کھیلنے میں ان کو مشورہ دینے لگے۔ کہ یہ پتا نہیں یہ پتا پھینکو اور ایک چال نہیں دو چالیں چلو وغیرہ یہاں تک کہ ایک دن خانصاحب ہم کو بھی تاش کھلانے میں کامیاب ہو گئے قاعدہ ہے

کہ نیا جواری ہمیشہ جیتا کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے ہی دن دو روپے کا سرمایہ لگا کر ہم نے چوبیس روپے جیتے۔ اب کیا تھا چسکا پڑ گیا۔ نور خان صاحب کے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اور روز کھیل رہے ہیں۔ شروع شروع میں خوب خوب جیتے اور یہ یقین ہو گیا۔ کہ ہم تاش کے معاملہ میں نہایت خوش قسمت ہیں۔ مگر جب عادت اچھی طرح پڑ چکی تو اب ہار شروع ہوئی۔ اور ہارے بھی ایسا ایسا کہ طبیعت ہرا ہو گئی۔ محدود آمدنی اور یہ شوق۔ نتیجہ یہ کہ ادھر ادھر سے قرض لینا شروع کر دیا۔ اور ایک مرتبہ تو پوری تنخواہ ہار جانے کے بعد مجبوراً ہم کو نسیم انتونی سے کہنا پڑا کہ ہم کو جس طرح بھی ہو سکے کسی سے تنخواہ کے برابر ایک رقم قرض دلوا دو۔ ہم تھوڑی تھوڑی کر کے ادا کر دیں گے۔ نسیم بیچارے کے پاس خود روپیہ موجود نہ تھا۔ لہٰذا ایک سود خوار آغا سے پراونوٹ پر روپیہ قرض لے کر بیوی کو جا کر تنخواہ دی۔ تاکہ اس غریب کو پتہ نہ چلے کہ اس کے "معصوم" شوہر نے کیا حرکتیں شروع کر رکھی ہیں ورنہ اسے بہت صدمہ ہوگا۔ مگر اب ہر مہینے ہم صرف سود دیا کرتے تھے۔ اصل دینے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ افسوس یہ کہ اصل کی ادائگی کے لیے ہم کو کسی اندر راجہ نل کی مہربانی کا انتظار تھا۔ مگر وہ ہارنے والوں پر ذرا کم ہی مہربان ہوتے ہیں۔ ہار کے ہو گئے، روپیہ کو واپس لانے کا خیال اور بھی ہراتا ہے۔ اور کھیل چھوٹنے نہیں دیتا یہ امید کہ کیا اب ہمیشہ ہارتے ہی جائیں گے۔ کھیل سے ہاتھ اٹھانے نہیں دیتی۔ نتیجہ یہ کہ سلسلہ در سلسلہ اور زنجیر در زنجیر قسم کا شغل بن جاتا ہے۔

بیوی سے لڑائیاں

اس تاش کے مشغلہ میں آدھی آدھی رات تک اور کبھی کبھی ساری ساری رات مشغول رہنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ کھیلنے بیٹھ گئے۔ پھر ہوش نہ رہتا تھا کہ وقت کتنا گزر گیا۔ کبھی رات کو دو بجے آتے۔ اور بیوی سے کہہ دیا کہ ایک مشاعرے میں پھنس گئے تھے۔ کبھی ایک بجے آئے اور کہہ دیا۔ کہ ایک جلسہ میں جانا پڑ گیا تھا۔ کسی رات دو بجے آئے۔ اور تھیٹر کا بہانہ کر دیا۔ مگر اب یہ روز کا مشغلہ تھا۔ اور روز نئے بہانے درکار تھے۔ وہ بیچاری کچھ دن تو یقین کرتی رہی۔ مگر اس کے بعد ایک فکر یہ پیدا ہو گئی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کبھی اس طرح غائب نہ رہتے تھے۔ اور اب تو کسی رات بھی صحیح وقت پر نہیں آتے۔ اگر کسی رات بارہ بجے تک آ گئے تو گویا یہ سر شام آ جانا سمجھا جاتا تھا۔ ایک مصیبت اور بھی کہ ہم تو خیر اس کار خیر میں جاگتے تھے مگر بیوی کو اس وحشت میں نیند ہی نہ آتی تھی۔ ان کی ساری شگفتگی ختم ہو کر رہ گئی تھی ان کی مشکوک نظریں ہم پر پڑنے لگی تھیں۔ اور جاگتے جاگتے اور ان ہی فکروں میں گھلتے گھلتے وہ واقعی کچھ بیمار سی رہنے لگی تھیں۔ اور مزاج میں بھی چڑچڑاپن پیدا ہو گیا تھا آخر اب وہ ہم سے لڑنے لگی۔ اور گھر پر ایک باقاعدہ مورچہ ہمارے خلاف قائم ہو گیا۔ ادھر سے چھوٹے غفرا اور ادھر سے بچے شکوے صاحب کے طعنے ہمارے بگڑ جانے اور بری راہ پر پڑ جانے کے یقین کا اظہار۔ اپنی بے کسی اور بے بسی کا

رونا۔ آنکھوں میں آنسو۔ چہرے پہ شوہر کی بے وفائی کا زرد غازہ۔ مختصر یہ کہ یہ سب کچھ کھل کر ہو جانے پہ تاشوں کا بھوت کس قیامت کا تھا۔ کہ ہم باوجود انتہائی کوشش کے سنبھلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ تاش کے ہر کھیل کے بعد توبہ کر کے اٹھتے تھے مالی نقصان۔ بیوی سے خراب تعلقات۔ اخلاقی خسارہ۔ ان سب پہ اس وقت نظر جاتی تھی۔ اور ہم گویا عہد کر لیتے تھے کہ اب کبھی تاش نہ کھیلیں گے۔ مگر دوسرے ہی دن جہاں آفتاب غروب ہوا۔ راجہ جی نے کان پکڑے اور ہم کو وہیں پہنچا دیا جہاں نہ جانے کا ہم فیصلہ کر چکے تھے۔ روز کا یہی قصہ تھا۔ روز توبہ اور روز شکست توبہ۔ پھر مصیبت یہ تھی کہ خود ہم نے جاگ جاگ کر اور ہار ہار کر اپنا مزاج خراب کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ بیوی بیچاری پر غصے شروع کر دیتے۔ وہ تو ہمارے قصور پہ ہم سے خفا تھی۔ اور ہم اس بے گناہ سے اس طرح لڑتے تھے۔ گویا یہ آزادیاں ہمارا حق تھیں۔ اور ان میں مداخلت کا اسے کوئی حق نہ تھا۔ میاں بیوی کے درمیان ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہو چکی تھی جس کے فاصلہ کا اندازہ تاش کے باون پتوں کو برابر برابر رکھ کر کر لیجئے۔

قمار بازی کے انجکشن

اسی زمانہ میں ہمارے داہنے کان کے نیچے ایک ورم سا پیدا ہو گیا جو کچھ ہی دنوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اس میں کوئی تکلیف نہ تھی مگر ورم بڑھتا

جاتا تھا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ تو معلوم یہ ہوا کہ یہ دراصل کنٹھ مالے کا مادہ ہے۔ اور اگر اس کا ابھی علاج نہ ہوا۔ تو اس کے بڑھ جانے کا پورا خطرہ موجود ہے۔ والدہ صاحبہ یہ سن کر بے حد پریشان ہوئیں۔ اور ہماری منہ بولی خالہ اماں بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب نے کہا کہ میاں اس کا جم کر علاج کرو۔ اور اخراجات کی پرواہ نہ کرو۔ جو صرف ہوگا میں دوں گی۔ ہم نے ان کو بتایا کہ ڈاکٹر بیس بائیس انجکشن لگانے کو کہتے ہیں۔ اور ہر انجکشن پندرہ روپیہ کا ہوگا۔ خالہ اماں نے کہا تم یہ انجکشن فوراً لگوالو۔ اور اس سلسلہ میں غفلت نہ برتو۔ چنانچہ اب ایک دن بیچ کر کے پندرہ روپے کا انجکشن اس طرح لگنے لگا۔ کہ ہم روپے لے کر جاتے تھے تاش کی بازی میں لگا دیتے تھے۔ اور ہار کر یا کبھی کبھی جیت کر گھر آجاتے تھے کچھ دن تو ہر انجکشن کی قیمت ہم کو ملی۔ اس کے بعد پورے کورس کا روپیہ خالہ اماں نے بھجوا دیا۔ اور ہم نے نہایت رئیس بن کر اس زمانہ میں تاش کھیلے اور کبھی ایک انجکشن بھی نہ لیا۔ مگر یہ بھی خدا کی شان ہے کہ وہ ورم رفتہ رفتہ کم ہو کر بالکل ختم ہو گیا۔ اور سب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ کرامت ان ہی انجکشنوں کی ہے۔

تاش کا جواز

ہم دیکھتے تھے کہ تاش کے کھیل کو ہماری بیوی نہایت حقارت سے جوا

کہا کرتی ہیں۔ مہذب طبقہ کا ایک معمولی مشغلہ ہے تمام تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے شریف زادے اس کو بغیر کسی قسم کا کوئی عیب سمجھے روزانہ کلب میں جاری رکھتے ہیں۔ گھروں پر کھیلتے ہیں۔ اور ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ہم نے جو ایک دن اپنے گھر پر احباب کو جمع کر کے تاش کھیل لیے تو بیوی سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ اور ہم کو جواری کا نہایت تکلیف دہ خطاب دے دیا گیا۔ ان کو در اصل اب تک اس کی اطلاع نہ تھی کہ ہم روز اسی شغل میں مصروف رہتے ہیں یہی ہے وہ مشاعرہ بھی ہے وہ جلسہ اور یہی ہے وہ تھیٹر جس میں ہم کو روزانہ آدھی آدھی رات تک اور کبھی ساری ساری رات مصروف رہنا پڑتا ہے ہم نے گھر پر اتفاقاً تاش بیٹھے تھے۔ کہ اگر بیوی نے اس کو مناسب نہ سمجھا تو بجائے اس کے کہ ہم گھر سے غائب رہیں۔ گھر ہی پر سب کو جمع کر لیا کریں گے۔ مگر وہ تو تاش کا نام سن کر آگ بگولا ہو گئیں۔ اور اس قدر بیزاری کا اظہار کیا اور ایسا لڑیں کہ ہم نے آئندہ کے لیے کان پکڑ لیے۔ کہ اب کبھی گھر پر تاش نہ کھیلیں گے۔ حالانکہ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ تاش کے کھیل کو جوا نہیں کہتے۔ تاشوں کے کھیل میں بازی لگا کر کھیلنا مہذب دنیا جائز قرار دے چکی ہے۔ بڑے بڑے وکیل اور بیرسٹر جج اور ڈسٹرکٹ حکام سب ہی تاش کھیلتے ہیں۔ ہر کلب میں تاش ہوتا ہے اور تاش کے کھیل کی مخالفت جہالت کی نشانی سمجھی جاتی ہے مگر وہ اس جہالت کے لیے تیار ہو گئیں۔ اور تاش کی مخالفت اور تاش سے نفرت میں کوئی فرق

پیدا نہ کرسکیں۔ بلکہ ان کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ یہ ہماری گمشدگیاں اسی تلاش کے بدولت ہیں۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور دامن پھیلا پھیلا کر ہمارے دوستوں کو کوسا کرتی تھیں اور ہم اس انتظار میں تھے کہ یہ ہم سے مایوس ہی ہو جائیں تو اچھا ہے۔ مگر اللہ ری وضع داری کہ ہر روز اسی دُم خم سے رات کو دیر میں آنے سے لڑتی تھیں۔ آدھی رات کو گھر میں ایک ہنگامہ ہوتا تھا۔ نئے عہد و پیمان ہوتے تھے توبہ کی جاتی تھی اور دوسری رات پھر وہی۔

روزنامۂ ہند

اخبار سرپنچ بھی نکل رہا تھا۔ اودھ اخبار میں ہم ملازم بھی تھے اور تاشوں کی یہ دنیا بہت خیر مسروفیت بھی تھی کہ اسی زمانہ میں روزنامہ سرپنچ دہلی کے ایڈیٹر مسٹر رام لال ورما نے لکھنؤ آکر ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کر کے ایک باقاعدہ روزنامہ جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ لکھنؤ میں آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہو گئی۔ لمیٹڈ کمپنی قائم ہو گئی پریس خرید لیا گیا۔ اور ہند کے نام سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے لیے ڈیکلریشن داخل کر دیا گیا۔ ورما صاحب نے امیر سنڈیلوی صاحب کی معرفت ہم کو اپنے اخبار کے عملہ میں آجانے کی دعوت دی۔ تنخواہ بھی اودھ اخبار سے زیادہ تھی دوسرے اودھ اخبار کی اس بے انصافی سے ہم بددل بھی ہو چکے تھے۔ کہ سال بھر تک ہم سے باقاعدہ ایڈیٹری کرائی تنخواہ میں کوئی اضافہ یا قائم مقامی کا کوئی مزید الاؤنس بھی نہیں دیا

اور پھر ایک دوسرے ایڈیٹر کو بلاکر ہم کو ہماری جگہ واپس کر دیا۔ ان حالات کے تحت ہم نے روزنامہ ہند کی اس دعوت کو منظور کر لیا۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ایک اپ ٹو ڈیٹ قسم کا باقاعدہ اخبار ہوگا۔ جس میں ذمہ دارانہ کام کرنے کا موقع ملے گا۔ اور کیا تعجب ہے کہ اسی بہانے ہم سے یہ تاشوں والی بری عادت بھی چھوٹ جائے اور واقعی نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ روزنامہ ہند میں اپنے کام کا چارج لینے کے بعد ہم بے حد مصروف ہو گئے۔ ہم کو اخبار کا نائٹ ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ رات کو نو بجے دفتر جاتے تھے۔ اور صبح چار یا پانچ بجے تک کام کرتے تھے۔ تمام رات تاروں کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔ اور ہم اپنے اسٹاف کے ساتھ ان تاروں کے ترجمے کرتے کاتبوں سے ان کو لکھواتے اور صبح چار بجے خبروں کی کاپی جڑواکر پریس کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور گھر آجاتے تھے۔ خبروں کے اس کام کے علاوہ شذرات اور مزاحیہ کالم بھی لکھنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے دن کو تھوڑی دیر کے لیے دفتر جانا پڑتا تھا۔ مگر یہ تھوڑی دیر اکثر اس قدر طول کھینچ جاتی تھی کہ چوبیس گھنٹے کی مسلسل ڈیوٹی کی نوبت آجاتی تھی۔ مگر اب ہم کو اطمینان تھا ایک تو یہ کہ تاشوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ دوسرے یہ کہ بیوی کو اب ہماری طرف سے یہ اطمینان ہو چلا تھا بلکہ اب ہم پر ترس آنے لگا تھا۔ کہ کہیں اس قدر شدید محنت کا کوئی ناگوار اثر صحت پر نہ پڑ جائے۔ جتنا وقت تھا وہ صرف دو کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ دفتر میں کام کرنا یا گھر پر سونا اخبار واقعی بہت شاندار تھا۔ اور انتظامات اس قدر ٹھاٹھ کے تھے۔ کہ ہم کو

اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی باقاعدہ اخبار میں کام کر رہے ہیں۔ اور اخبار نویسی جس کو کہتے ہیں وہ درحقیقت اب شروع ہوئی ہے۔ رام لال صاحب ورما کو ہم پر بے حد اعتماد تھا۔ اور وہ ہمارے کام سے نہایت خوش تھے۔ مگر ان میں تمام خوبیوں کے باوجود ایک کمزوری بہت بری تھی۔ کہ کان کے کچے واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ ہمارے ہی اسٹاف کے ایک صاحب نے ہمارے خلاف ان کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ اور ان کی رائے خراب ہونے لگی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھنچے کھنچے سے رہنے لگے۔ مگر قبل اس کے کہ یہ اختلاف سامنے آتے روزنامہ ہند کی زندگی کے دن پورے ہوتے نظر آئے۔ لمیٹڈ کمپنی تو تھی ہی۔ ساجھے کی ہانڈی اس کا چوراہے پر پھوٹنا ضروری تھا۔ کچھ حصہ داروں نے وعدہ کرنے کے باوجود اپنے حصہ کی رقم نہیں دی۔ کچھ نے اخبار کی پالیسی میں مداخلت کرنا چاہی۔ مختصر یہ کہ تھوڑے دنوں میں ایسی گڑبڑ پیدا ہوئی کہ اخبار بند تنخواہ غائب اور ہم پھر گھر پر۔

پنجاب کا پہلا سفر

کسی کو کلکتہ اور بمبئی دیکھنے کا شوق ہوتا ہے کسی کو کشمیر جنت نظیر کی زیارت کی تمنا۔ مگر ہم کو نہ معلوم کیوں ہمیشہ سے لاہور دیکھنے کی تمنا تھی۔ بچپن ہی سے لاہور میں ہمارے لیے خدا جانے کیا کشش تھی کہ ہمیشہ لاہور جانے کو دل چاہا۔ مگر یہ تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی۔ مگر جب اس تمنا کے بر آنے کا وقت آیا۔ تو اچانک پونڈی

بھی اس طرح ہو گئی کہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے فرمایا
چلتے ہو پنجاب۔ دل نے کہا نیکی اور پوچھ پوچھ۔ وہ لاہور سے بھاوج صاحبہ مسز عمر کو لینے
جا رہے تھے اور ارادہ تھا کہ راستہ میں قادیان بھی ٹھہریں گے چنانچہ ہم ان کے ہمراہ
ہو گئے۔ امرتسر پہنچ کر ہم لوگ قادیان کی طرف مڑ گئے۔ قادیان پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت
مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب ڈلہوزی تشریف لے گئے ہیں۔ پھر بھی تمام دن
قادیان میں گذرا۔ قادیان کے مختلف شعبے سرسری طور پر دیکھے۔ بہشتی مقبرہ دیکھا
اخبار الفضل کے دفتر گئے۔ قاضی اکمل صاحب سے ملے۔ اور سہ پہر کو یہ سن کر کہ
آج ہی حضرت صاحب ڈلہوزی سے شملہ جاتے ہوئے امرتسر سے گذریں گے
ہم لوگ واپس امرتسر آ گئے۔ اور امرتسر میں حضرت صاحب سے ملاقات ہو گئی
خیال تھا کہ ہم کو دیکھتے ہی احمدیت کی تبلیغ شروع کر دیں گے۔ ہم کو بیعت کی دعوت
دی جائے گی۔ اور ہم جب انکار کریں گے تو ڈاکٹر صاحب کو ہدایت دی جائے
گی۔ کہ ان کو جماعت کا لٹریچر پڑھنے کو دیا جائے۔ مگر نہ وہاں احمدیت کا کوئی
ذکر تھا نہ بیعت کا کوئی سوال نہ کوئی ایسی بات جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ہم کو
غیر احمدی سمجھا جا رہا ہے۔ اور احمدی بنانے کی تحریک ہو رہی ہے۔ بلکہ بجائے
اس کے حضرت صاحب نے کچھ ادبی اور کچھ شاعرانہ گفتگو چھیڑ دی تاکہ ہم کو
دلچسپی ہو سکے سب نے مل کر ریفریشمنٹ روم میں ہندوستانی کھانا کھایا۔ اور
اس کے بعد حضرت صاحب شملہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس پہلی ملاقات

میں ان کی گفتگو کا رُخ زیادہ تر سیاسیات کی طرف تھا۔ اور ہم صرف یہ اندازہ کر سکے کہ ان کی مذہبی حیثیت تو درکنار ان کی سیاسی حیثیت بھی نہایت بلند ہونا چاہیئے۔ جو گہری نظر ان کی سیاست کی باریکیوں پر پڑ رہی تھی۔ وہ صرف ایک مشتاق ماہر سیاست کی ہو سکتی تھی۔ ادبی معاملات میں جو گفتگو آپ نے فرمائی وہ خالص ادبی رنگ لیے ہوئے تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ایک منجھا ہوا ادیب یہ باتیں کر رہا ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ نگاہیں نیچی۔ لبوں پر تبسم اور آواز میں ایک دلکشی غالباً ان ہی باتوں کو غیر احمدی قادیانیوں کی جادوگری کہتے ہوں گے۔

لاہور کی سیر

امرتسر سے رخصت ہو کر ہم لوگ لاہور پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی سسرال میں اور ہم اپنے دوست میاں ایم۔ اسلم کے یہاں ٹھہر گئے۔ اسلم صاحب نے مدارات کی حد کر دی۔ لاہور میں ہمارے لیے لکھنؤ تک کے آم فراہم کر دیئے۔ بات بات پر سکنجبین، پھلوں کے عرق اور دسترخوان بالکل واجد علی شاہی۔ آپ ہی کے یہاں سب سے پہلے پنڈت ہری چند اختر۔ مدن جی۔ علم الدین سالک اور غالباً ڈاکٹر تاثیر سے ملاقات ہوئی۔ اور خود جا کر سید امتیاز علی صاحب تاج۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی صاحب اور عبدالمجید صاحب سالک سے ملے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جہانگیر کا مقبرہ۔ شالامار باغ۔ ڈاکٹر اقبال اور سر عبدالقادر کو دیکھا۔ ان

دونوں بزرگوں کا ذکر تاریخی مقامات کے ساتھ اس سبب آ گیا ہے کہ یہ حضرات بجائے خود تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔

سر محمد اقبال

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سر عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال کے یہاں پہنچے۔ سر عبدالقادر سے جتنی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ آپ نے ایک مرتبہ بھی یہ اندازہ نہ ہونے دیا کہ آپ پنجابی ہیں۔ تلفظ کا بالکل صحیح تلفظ اور لب ولہجہ میں اردو سے وہ مغائرت نہیں جو عام طور پر پنجاب میں نظر آتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ آپ ایک مقدمہ میں کچھ مصروف تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں ٹھاٹھ ہی کچھ اور تھے۔ نام کے ساتھ سر ضرور لگا ہوا تھا مگر وضع عجیب درویشانہ تھی۔ ایک تہبند باندھے دو تین حاضرین سے بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ اور حقہ چل رہا تھا۔ حاضرین میں ایک صاحب ہمارے بھی جاننے والے تھے۔ یعنی محمد عسکری صاحب مجازی لکھنوی۔ آپ خدا کے منکر اور مذہبیات میں ایک انقلاب عظیم کے علمبردار تھے۔ لوگ ان کو مجذوب سمجھا کرتے تھے۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ لاہور کب اور کیسے تشریف لائے۔ سر محمد اقبال نے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا کہ آپ میری زبان درست کرنے اور مجھ کو زبان کے سلسلہ میں مشورے دینے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ مجازی صاحب نے

انکسار کے ساتھ تبسم فرمایا۔ گویا ڈاکٹر صاحب سچ کہہ رہے ہیں۔ مگر نیچہ کس قابل ہے اس وقت تو ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن دوسرے دن ہم چپکے سے پھر حاضر ہوئے۔ مگر اس وقت بھی کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں اس وقت موضوع بحث یہ تھا کہ فحشیات اردو زبان کے لٹریچر سے آب تک باہر ہیں۔ یہ عنصر کھلم کھلا سامنے آچکا ہے اسی بحث کے سلسلہ میں ہم نے ڈاکٹر صاحب کو رفیع احمد خان کا ایک شعر اسی رنگ کا سنایا۔ ڈاکٹر صاحب اچھل کر بیٹھ گئے۔ شعر پھر پڑھنے کی فرمائش فرمائی۔ اور آخر کار باقی حضرات سے رخصت ہو کر ہم کو جانے کی اجازت نہ دی۔ اور حکم دیا کہ ان صاحب کے اور شعر یاد ہوں تو سناؤ۔ ہم نے کافی شعر سنائے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بڑی خیریت ہوئی کہ یہ حضرت اس طرف متوجہ ہوگئے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ عام شاعری فرماتے تو بہت سے شاعروں کا پتہ نہ چلتا کہ کیا ہوئے۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

پھر سرپنچ

سرپنچ تو اپنا تھا ہی۔ مگر اب تک سرپنچ سے کسی قسم کا کوئی مالی معاملہ سوائے اس کے نہ ہوا تھا کہ جس مکان میں ہم رہتے تھے۔ اس کا کرایہ دفتر کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ مگر شہر کے بعد اب تو گویا سرپنچ کو ہماری پوری کفالت کرنا تھی۔ چنانچہ

نسیم صاحب سے باقاعدہ معاملات طے ہو گئے۔ اور ہم نے سرپنچ کی ذمہ دارانہ خدمات انجام دینا شروع کر دیں۔ اب تک سرپنچ ہمارا تھا۔ اور اب ہم سرپنچ کے ہو گئے۔ مگر سرپنچ کی مالی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ یہ ہاتھی باندھ سکتا پھر بھی کچھ نہ کچھ روپیہ ہم کو دفتر سے حسب قرارداد ملتا رہتا تھا۔ اور ہم کو کوئی خاص تکلیف نہ تھی۔ گھر کی فضائیں بھی درست تھیں۔ بیوی کو اب ہماری غیر حاضریوں کا شکوہ نہ تھا۔ مگر وہ جو اطمینان ان تمام واقعات سے پہلے ان کو ہماری طرف سے تھا سو وہ اب باقی نہ رہا تھا۔ اور وہ برابر مشکوک نظروں سے ہم کو دیکھا کرتی تھیں۔ کہ خدا جانے یہ حضرت کب پھر اسی راستہ پر لگ جائیں۔ وہ تو وہ ہم خود اپنے ارادوں میں کچھ مستقل نظر نہ آتے تھے۔ رفیع احمد خان سے ملاقاتیں اب بھی ہوتی تھیں۔ مگر وہ ہر وقت کا ساتھ تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ ہم اس دور کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ مگر تلافی کر سکیں گے یا نہیں اس کا ہم کو ابھی تک یقین نہ تھا۔

رسالہ شباب

نسیم صاحب کے پاس اگر کہیں ان کے حوصلہ کے برابر روپیہ بھی ہوتا تو یہ بلا کا ازخود رفتہ انسان نہ جانے کہاں پہنچتا۔ کبھی پیسہ کوڑی کی لنگوٹی ہیں وہ وہ پھاگ ان حضرت نے کھیلے کہ لوگ یہ سن کر حیران رہ جاتے تھے۔ کہ نسیم سرمایہ دار نہیں بلکہ مزدور ہیں۔ سرپنچ کے جو رسالنامے آپ نے نکالے ہیں۔ وہ ممکن تو ہے

کہ پنجاب کے اخباروں کے لیے معمولی بات سمجھے جائیں۔ مگر یوپی میں یہ حوصلہ صرف ان ہی حضرت کے حصے میں آیا تھا۔ حریم کے خاص نمبر نکالنا ان کے لیے ایک عام بات ہو کر رہ گئی تھی۔ اب آپ سرپنچ کا ایک ماہوار علم ایڈیشن بھی نکال رہے تھے۔ جو باقاعدہ ایک مصوّر رسالہ تھا۔ ہر ماہ پندرہ بیس تصاویر کے ساتھ انگریزی رسائل کی ٹکر کا یہ رسالہ نکل رہا تھا۔ اور اس کا سالنامہ تو ایسا نکالا تھا۔ کہ آج تک اس کی دھوم ہے۔ اسی زمانہ میں آپ کو یہ بھی سوجھی کہ ایک خالص ادبی قسم کا ماہنامہ نکالا جائے۔ نام تجویز ہوا شباب ایڈیٹر ہوئے یہ شباب کی حدوں سے عنقریب گذرنے والے شوکت تھانوی۔ نسیم صاحب کے زیر اہتمام کوئی سیکنڈ کلاس چیز نہیں نکل سکتی تھی۔ نہایت شاندار یہ رسالہ بھی نکلا۔ چوٹی کے لکھنے والوں نے مضامین دیئے۔ لوگوں نے بڑی بڑی توقعات اس رسالہ سے بھی وابستہ کر لیں۔ اس لیے کہ یہ بھی سرپنچ جرنلس کا ایک شگوفہ تھا۔ چار پانچ نمبر بڑی دھوم سے نکلے۔ مگر اس کا نہایت ناگوار اثر سرپنچ پر پڑنے لگا۔ اور آخر کار طے یہ کرنا پڑا کہ سرپنچ اور شباب دونوں میں سے کس کو کس پر قربان کر دیا جائے۔ آخر سرپنچ پر ہم نے اپنا شباب قربان کر دیا۔ اور لوگوں سے کہہ دیا کہ بوڑھے منہ یہ مہاسے اچھے نہ معلوم ہوتے تھے۔ حالانکہ لوگوں کے لیے یہ تماشہ بھی بیحد دلچسپ تھا۔

ریڈیو ٹاکر

اسی زمانہ میں دہلی سے مولوی محمد حسین آزاد کے نواسے آغا محمد اشرف صاحب جو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھے، سرکاری طور پر دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ بھی تشریف لائے۔ اور ہم کو ڈھونڈ کر ہمارے پاس پہنچے۔ آپ نے ہم کو دہلی سے ایک آدھ تقریر براڈ کاسٹ کرنے کے لیے کنٹریکٹ فارم پر دستخط کرائے اور آخر ہم مقررہ تاریخ پر دہلی سے براڈ کاسٹ کرنے پہنچ گئے۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر جانے کا صرف پہلا اتفاق ہی نہ تھا بلکہ خواہ کوئی کتنا ہی بیوقوف کیوں نہ سمجھے ہم کو یہ عرض کرنے میں شرمانا نہ چاہیے کہ اب سے پہلے ہم نے کبھی ریڈیو تک نہ سنا تھا۔ مگر اب ریڈیو سننے والوں کو اپنی آواز سنانا چاہتے تھے۔ یہاں آغا اشرف صاحب کے علاوہ اسرارالحق صاحب مجاز سے بھی ملاقات ہوئی جو رسالہ آواز یعنی ریڈیو کے اردو رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ اور جن سے ہم پہلے ہی لکھنؤ اور دلی میں متعدد بار مل چکے تھے مجاز صاحب نے اسی وقت ملک ذوالفقار صاحب بخاری اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ملایا۔ جو نہایت خصوصیت کیساتھ ہم سے ملے اور اسی دن شام کو نئی دلی کے نہایت شاندار ہوٹل میں ہم کو چائے پر مدعو کیا۔ بخاری نہایت تیز ذہین۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی چلت پھرت سے خاص طور پر ریڈیو کے لیے موزوں ترین شخصیت ثابت ہوئے۔ آپ سے شام تک اس حد تک بے تکلفی ہو چکی تھی کہ آپ نے

اپنا کچھ کلام بھی سنایا۔ اور ہر طرح ہم کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ ریڈیو میں ہمارے لیے کوئی اجنبیت نہیں ہونا چاہیے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان سے آج ہی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔ ہم نے مقررہ وقت پر اپنی تقریر براڈکاسٹ کی، چک لیا، اور چلے آئے۔ پندرہ دن کے بعد دوسری تقریر تھی۔ اس موقع پر بھی بخاری صاحب بہت ہی خصوصیت سے پیش آئے۔ اس روز ہم تقریر ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکلے تو ہم کو اطلاع دی گئی کہ فیاض احمد صاحب کوئی بزرگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور ملاقات کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ہم نے دماغ پر لاکھ لاکھ زور دیا کہ ہمارے کس دوست کا نام فیاض احمد ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اب جو ملاقات کے کمرے میں پہنچتے ہیں۔ تو چچا میاں تشریف فرما تھے۔ بڑے پیار سے فرمایا۔ "شیطان کہیں کا۔ میں تیری شرارتیں سن رہا تھا۔ ابھی دہلی آیا ہوا تھا۔ سنا کہ تم بھی یہیں ہو۔ تم سے ملنے آگیا۔ چچا میاں سے تقریباً آٹھ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ رات ہی کے ساتھ ان کی ہمشیرہ نسبتی کے یہاں گئے رات کا کھانا وہیں کھایا۔ اور یہ وعدہ کر لیا۔ کہ اب کی مرتبہ آیا تو آپ کو اطلاع کر دونگا چنانچہ اب یہ معمول ہو گیا کہ دہلی آنے سے پہلے اپنے براڈکاسٹ کی تاریخ کی اطلاع تھانہ بھون بھیج دیتے تھے اور وہاں سے چچا میاں دہلی آجایا کرتے تھے۔

بیوی سسرال گئیں

ہماری والدہ صاحبہ نے ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔ یعنی شادی کے بعد سے بیوگی تک کبھی آپ اپنی سسرال تشریف نہیں لے گئیں۔ اور نہ والد صاحب ان کو لے گئے۔ اس لیے کہ خود ان کو اپنے گھر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ کہتے یہی تھے کہ میں جس شان کے ساتھ بیوی کو تھانہ بھون لے جانا چاہتا ہوں۔ اس کا امکان ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کو لے کر جاؤں۔ مختصر یہ کہ وہ اس امکان کا انتظار کرتے ہی کرتے اپنے حقیقی وطن روانہ ہو گئے۔ اور والدہ صاحبہ میکے ہی میں سہاگن بن کر میکہ میں بیوہ بن کر رہ گئیں۔ اور رخصتی کی گویا کبھی نوبت ہی نہ آئی۔ مگر اس سلسلہ میں ہماری بیوی تیز نکلیں۔ ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ چچا میاں ہر براڈکاسٹ کے موقع پر دہلی آجایا کرتے ہیں۔ اور کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ دلہن اور بچوں کو لے کر آؤ تھانہ بھون، تو ایک مرتبہ آپ ہمارے ساتھ دہلی چلنے کو تیار ہو گئیں۔ اور پروگرام یہ بنایا کہ دہلی کی سیر۔ وہاں سے مظفر نگر کی روانگی۔ جہاں ان کے عم محترم اور ہمارے برادر محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب صدر اسپتال کے انچارج تھے۔ اور پھر مظفر نگر سے تھانہ بھون کی روانگی۔ چنانچہ دہلی پہنچ کر آپ نے پہلے تو دہلی کے سیاپے کیے۔ کبھی جامع مسجد میں ہیں تو کبھی چاندنی چوک میں۔ کبھی قطب مینار کی سیر ہو رہی ہے۔ تو کبھی اوکھلے کی۔ اور آخر شام کو جب ہم براڈکاسٹ

کرنے پہنچے تو آپ ہمارے ہمراہ ریڈیو اسٹیشن پر بھی موجود تھیں۔ اور ریڈیو اسٹیشن کا معائنہ کرنا چاہتی ہیں۔ یہ بھی دیکھنا منظور تھا۔ کہ براڈ کاسٹ کرتے وقت ان کا شوہر کیا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کو آخر کس مشین میں رکھ دیا جاتا ہے۔ کہ یہ بولنے لگتا ہے۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ کوئی صاحب ایس مہرا۔ جو ڈیوٹی پر ہیں وہی ریڈیو اسٹیشن کی سیر کرا دیں گے چنانچہ پہلی مرتبہ برادرم جگل کشور صاحب مہرا سے ملاقات ہوئی آپ نے نہایت خشک مگر نہایت مہذب طریقہ پر ریڈیو اسٹیشن کی سیر بیوی کو کرائی۔ ایک ایک بات سمجھائی کہ اس طرح براڈ کاسٹ کیا جاتا ہے۔ یوں آواز ٹرانسمیٹر تک جاتی ہے۔ اور وہاں سے اس طرح نشر ہو جاتی ہے۔ جگل صاحب کے متعلق اس روز ہم صرف یہی رائے قائم کرکے رہ گئے۔ کہ یا تو یہ حضرت نہایت اُدم بیزار ہیں۔ ورنہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہیں۔ اخلاقاً بھی تو آپ کے چہرے پر ہنسی نہ آئی۔ حالانکہ ہم نے زندگی بھر شاید ہی کسی کے متعلق اتنی غلط رائے قائم کی ہو۔ جتنی جگل صاحب کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی۔ وہاں تو بیزاری کا سوال ہی نہیں باغ و بہار قسم کا ایک ایسا دوست جو بجائے خود ایک انجمن کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال جگل صاحب کے متعلق کچھ عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ان کے متعلق تو بہت کچھ کہنا ہے۔ جو آئندہ کہا جائے گا۔ مختصر یہ کہ دہلی کے اس تمام سیر سپاٹے کے بعد بیگم صاحبہ ہمارے اور اپنے خسر محترم یعنی چچا میاں کے ساتھ معہ دونوں بچوں کے مظفر نگر روانہ ہو گئیں۔

مظفر نگر کے اسٹیشن پر عجیب منظر ہمارے سامنے تھا۔ ایک طرف تو ڈاکٹر محمد عمر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے ہم لوگوں کو لینے، دوسری طرف خان بہادر کنور عنایت علی صاحب کے یہاں سے ایک پردہ دار کار آئی تھی چچا میاں کی بہو کو اتارنے۔ چنانچہ چچا میاں نے اپنے زیر اہتمام پلیٹ فارم پر چادریں تنوانا شروع کردیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک منٹ تو یہ تماشا دیکھا اور اس کے بعد چچا میاں سے کہا، "بیٹے جناب یہاں یہ میرے یہاں آئی ہیں۔ اور میرے طریقہ پر میرے ساتھ جائیں گی۔ جب آپ تھانہ بھون لے جائیں۔ اس وقت آپ کو اختیار ہے۔" یہ کہہ کر سعیدہ کا پکڑا ہاتھ اور اپنی کھلی کار پر لے کر انہیں اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ چچا میاں خاموش رہ گئے۔ مظفر نگر میں اپنے والد کے احباب اور چچا میاں کے دوستوں سے مل کر اور ایک آدھ دعوت کھا کر تیسرے روز بذریعہ کار تھانہ بھون روانہ ہو گئے۔ جہاں جانے کی میرے بچوں کو اس قدر خوشی تھی کہ چھوٹا بچہ خورشید تمام راستہ کار کے سامنے آنے والے ہر مویشی سے چیخ کر کہتا تھا۔ "ارے گائے ہٹ ہم دادی کے پاس جا رہے ہیں۔"

تھانہ بھون

تھانہ بھون آنے کا ہمارے لیے یہ دوسرا اتفاق تھا اور بیوی بچوں کے لیے پہلا اتفاق۔ پہلی مرتبہ بہت ہی کم سنی میں آئے تھے۔ ہماری چچی بھی دوسری نہیں،

اور تھانہ بھون کے دو دن کے حالات تو در کنار چچی تک بدل چکی تھیں۔ ہمارے ساتھ اس وقت چچی نہایت محبت سے پیش آئی تھیں۔ اور اب یہ چچی بہت ہی محبت سے ہمارے اور بچوں کے ساتھ پیش آرہی تھیں۔ تھانہ بھون کے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا ایک غریب الوطن بھائی تھانہ بھون آیا ہے۔ تو ایک اجتماع سب نے مل کر کیا۔ اور ہم کو اس میں بلا کر سب ہم سے ملے۔ محفل مشاعرہ منعقد کی گئی۔ دعوتیں ہوئیں۔ اور آخر چار پانچ روز کے قیام کے بعد ہم تھانہ بھون سے لکھنؤ روانہ ہو گئے ہمارے آنے کی خبر سہارنپور تک پہنچ چکی تھی۔ اور سہارنپور کے لوگوں کو ہمارا پروگرام معلوم ہو گیا تھا۔ لہذا اب سہارنپور کے اسٹیشن پر ایک حملہ ہوا دس بارہ شاعر قسم کے اہل وطن نے ہم کو گھیر لیا۔ کہ ایک دن سہارنپور میں بھی رہنا پڑے گا۔ مگر ہم اپنی مجبوریوں کے اظہار کے بعد آزاد کر دیئے گئے۔ البتہ اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان حضرات کی مدد سے سہارنپور سے لکھنؤ تک نہایت آرام دہ سفر کا انتظام ہو گیا۔ اور تمام راستہ اس طرح گذرا گویا ہم نے ایک ڈبہ اپنے اس مختصر خاندان کے لیے مخصوص کرا لیا تھا۔

سادھو

وطن جانے کو تو چلے گئے۔ اور بخیریت تمام واپس بھی آگئے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ والد صاحب نے اپنے بال بچوں کو وطن نہ لے جانے کی جس دانشمندی

سے ہمیشہ کام لیا تھا وہ کیا تھی۔ ہماری بیوی کو جب تھانہ بھون کے اعزہ میں گشت کرایا گیا۔ تو ان کو عجیب عجیب باتیں سننا پڑیں۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا کہ یہ سادھو کہاں سے آگیا ہے۔ یعنی وہ ساری باندھے ہوئے تھیں اور سوائے بندوں اور چوڑی کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ اور تھانہ بھون میں اس وقت تک عورت کو عورت کا درجہ حاصل ہو ہی نہیں سکتا، جب تک وہ سر سے پیر تک زیور میں لدی ہوئی نہ ہو کسی نے کہا۔ میم صاحب ہیں۔ کسی نے بہت شفقت برتی تو بیوی سے کہہ دیا۔ دلہن ننگی ہی چلی آئیں۔ ننگی سے مطلب، کپڑوں کے بغیر چلے آنے سے نہ تھا۔ بلکہ تھانہ بھون میں عورت کی ستر پوشی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے کپڑے اس کے زیوروں سے نہ چھپ جائیں۔ ہماری بیوی کے پاس اوّل تو اتنے زیور ہی نہ تھے اور اگر ہوتے تو بھی وہ اس طرح زیورات کی چلتی پھرتی دکان بن کر ہرگز نہ جاتی۔ ہم تو نہایت بے تکلفی سے اپنے گھر گئے تھے، زیورات کی کسی نمائش میں نہیں گئے تھے۔ دل دکھانے اور دل دیکھنے کی تمنا تھی۔ کڑے چھڑے اور پازیب کی جھنکاریں سنانے نہ گئے تھے۔ نہ سننے کا اشتیاق تھا والد صاحب بھی غالباً یہ چاہتے ہوں گے کہ بیوی کو پہلے سر سے پیر تک لاد لیں۔ تھانہ بھون پہنچ کر بیوی کو سونے چاندی کے دریا بہانے کے قابل بنا دیں اس وقت وطن لے بھی جائیں تاکہ وہاں بھی لوگوں کو معلوم ہو کہ محل والی کی بہو آئی ہے۔ جب بیوی نے ہم کو اہلِ وطن کے یہ ریمارک سنائے تو ہم مسکرا کر رہ

گئے۔ اور ہم نے ان سے کہا کہ والد صاحب کی اس مصلحت کے آخر کچھ تو معنی ہوتے ہی۔ اور والدہ صاحبہ کے کبھی سسرال نہ جانے کا کوئی نہ کوئی مفہوم تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔

گھرستان

میری نظموں اور غزلوں کا مجموعہ گھرستان کے نام سے عرصہ سے زیر ترتیب تھا۔ اور میں اس کو خود چھاپنا چاہتا تھا۔ برادرِ محترم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے اس کی طباعت کے لیے تمام انتظامات اس طرح کر دیئے تھے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی۔ اور رنگ چوکھا آئے۔ چنانچہ ہم کو کچھ صرف کرنا بھی نہیں پڑا۔ اور کتاب بھی خود ہم نے چھاپ لی۔ اس مجموعہ کا مقدمہ برادرِ محترم خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر۔ ایم۔ بی۔ای وزیر ریاست کشمیر نے لکھا۔ اور ہم نے اس کو خان بہادر نواب بہادر ڈاکٹر نواب سر محمد مزمل اللہ خان صاحب کے سی، آئی، ای کے نام معنون کر دیا۔ نواب بہادر صاحب نے لکھا کہ آپ اس مجموعہ کو لے کر خود علی گڑھ آجائیے۔ چنانچہ کتاب کے پریس سے آتے ہی ہم اُسے لے کر نواب بہادر صاحب کے منزّل ہبیس علی گڑھ حاضر ہوئے اس موقعہ پر نواب صاحب بہادر نے ہماری نہ صرف بہت زیادہ آؤ بھگت کی۔ بلکہ ہمارے اعزاز میں اپنے یہاں اپنے احباب کو ایک پارٹی دے کر ہمارا

سب سے تعارف کرایا۔ اور ایک چھوٹی سی تقریر میں فرمایا کہ میں شوکت تھانوی سے بحیثیت ایک مزاح نگار کے واقف تھا مگر بحیثیت شاعر کے آج ان سے ملا ہوں تو اس موقع پر خود غرض بننا نہیں چاہتا بلکہ چاہتا ہوں کہ ان کی شاعرانہ صلاحیت سے میرے تمام دوست جن کو میں یہاں یکجا کر سکا ہوں لطف اندوز ہوں اس کے بعد دیر تک ہم اپنی نظمیں اور غزلیں سناتے رہے۔ نواب بہادر صاحب نے اپنے اثر سے اور خود اپنے احباب کے اثر سے نہ صرف ہماری کتابوں کے کافی خریدار دلوائے۔ بلکہ ہم کو بہت اصرار کے ساتھ واپسی کے وقت کچھ تحائف اور کچھ نذرِ نقد بھی مرحمت فرمایا جس کو قبول کرنا ہم نے اس لیے باعثِ شرم نہ سمجھا کہ اول تو نواب بہادر صاحب واقعی بزرگانہ شفقت کے ساتھ پیش آئے تھے دوسرے ہمارا ارادہ تھا کہ ہم خود اپنا ایک ڈپو قائم کریں گے۔ لہٰذا اس کے لیے سرمایہ کی ضرورت بھی تھی۔ نواب بہادر صاحب سے اس ملاقات کے بعد بھی جس کسی کی ہم نے کوئی سفارش کر دی یا جس ادارہ کو نواب بہادر صاحب سے کچھ دلوانا چاہا۔ کبھی اس سلسلہ میں ہم کو مایوس نہیں کیا گیا۔ اور خود ہم کو نواب بہادر صاحب نے مختلف مواقع پر جو امداد پہنچائی ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

سر محمد ظفر اللہ خاں

گہرستان کی ایک جلد برادرِ محترم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے اپریل

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان کو بھی بھیجدی تھی۔ چوہدری صاحب نے اس کتاب کو گول میز کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اور اس پر عجیب حالات میں تذکرہ لکھ کر بھیجا۔ جو رسالہ نیرنگ خیال لاہور میں چھپ چکا ہے۔ یوں تو گہرستان پر علامہ سر محمد اقبال۔ سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ۔ سر محمد مزمل اللہ خان۔ سر سید لیاقت علی وغیرہ بہت سے بزرگوں نے تذکرہ کیا تھا۔ مگر سر محمد ظفر اللہ کا یہ تبصرہ رسمی اور دفتری قسم کا نہ تھا۔ سر ظفر اللہ نے فرمایا کہ یہ کتاب ایک سوٹ کیس میں رکھی ہوئی تھی اور وہ سوٹ کیس اسی سفر میں ایک جگہ سمندر میں جا گرا۔ بمشکل تمام اس کو نکالا گیا۔ اور گہرستان کو پھر میں احتیاط کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اسی تبصرہ میں ایک جگہ سر ظفر اللہ نے ایک عجیب بات فرمائی ہے۔

"میں تو شوکت صاحب کی دلی کیفیات کا اندازہ کر کے خوش ہو رہا ہوں۔ اور لطف اندوز بھی اور ساتھ ہی ساتھ مجھے یقین بھی ہے۔ کہ شوکت صاحب کو یہ احساس ہوگا کہ میں ان کے تخیل کی پرواز اور فکر کی گہرائیوں سے بالکل بے بہرہ ہوں۔ صاحب کلام ایک کیفیت کا اظہار ایک خاص ترکیب الفاظ سے کرنا چاہتا ہے۔ پڑھنے والے

اور سننے والے اپنے اپنے ذوق اور ظرف
کے مطابق اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ میں
اگر شوکت صاحب کے فکر و تخیّل کا مالک ہوتا
تو میں بھی اپنی کیفیاتِ قلبی کو مزیّن الفاظ اور مرصّع
ترکیبوں میں ادا کر سکتا۔"

اس اقتباس کے بعد ایک لطیفہ پیش کیا جاتا ہے کہ دہلی کے ایک رئیس اکثر اس خاکسار سے کلام سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ اور اس خاکسار کا دم نکل جایا کرتا تھا اس فرمائش پر، اس لیے کہ پھر شروع ہوتے تھے ان کے وہ تبصرے جن کا ہمارے بیچارے شعر سے دور کا تعلق بھی نہ ہوتا تھا کہنے لگے میاں ٹھہرو دوسرا مصرعہ ابھی نہ پڑھنا۔ پتہ بھی ہے تم کو کیا کہہ دیا ہے۔ تم نے یہ کہا ہے۔ یہ کہا ہے اور یہ کہا ہے۔ یعنی جو ہم نے نہیں کہا تھا وہ سب یہ بزرگ فرماتے تھے۔ اور آخر میں کہتے تھے کہ اب تم ہی بتاؤ کہ اس کے بعد دوسرے مصرع کی کیا ضرورت رہ سکتی ہے۔ پہلا ہی مصرعہ مکمل شعر ہے۔ اور دوسرا مصرعہ محض بھرتی کا ہوگا جب دوسرا مصرعہ سنایا تو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ آنکھیں بند کر کے کچھ غور فرمایا۔ اور ایک دم چونک کر بولے۔ نہیں صاحب دوسرے مصرعے نے حالات ہی بدل دیئے۔ اب اس شعر کا مفہوم یہ ہُوا۔ یہ ہُوا۔ اور یہ ہُوا۔ یعنی جو کچھ نہیں ہُوا تھا وہ بیان فرما گئے۔ سر محمد ظفر اللہ خان نے اس تبصرے میں کسی

ایک موقع پر بھی ہمارے کسی شعر کو کسی ایسے رنگ میں پیش نہیں کیا ہے۔ جو ہمارے مفہوم سے علیحدہ ہو۔ مگر بات یہ بالکل سچی کہی ہے۔ کہ شاعر کچھ کہتا ہے اور سمجھنے والے اس کو اپنے اپنے رنگ میں سمجھا کرتے ہیں۔ ہماری ایک نعمانی صاحبہ ہیں آپ پڑھی لکھی تو خیر نہیں ہیں۔ مگر سخن شناس بہت ہیں۔ ہمارے شعر سننے کا بڑا شوق ہے اور ہر شعر سن کر یہی ایک بات ہمیشہ کہتی ہیں۔ کہ چاہے اس شعر کو اِدھر لے جاؤ، چاہے اُدھر لے جاؤ۔ مطلب ہوتا ہے۔ "اِدھر اُدھر" کا حقیقت اور مجاز مگر یہ بات پیدا تو وہ جاتی نہیں البتہ اِدھر اُدھر سے مفہوم پورا کر دیتی ہیں۔ سر محمد ظفر اللہ کے اس بیان کی تصدیق دیوانِ غالب کی مختلف شرحیں دیکھ کر کیجیے۔ کاش غالب خود زندہ ہوتے اور اپنا مفہوم خود بھی بیان کر سکتے۔

طوفانِ تبسم

اپنی بک ڈپو قائم کرنے کا مستقل خیال تھا۔ اب تک ہماری تین کتابیں نکل پائی تھیں۔ "موجِ تبسم" اور "بحرِ تبسم" نسیم انہولوی صاحب نے چھاپی تھیں۔ "سیلابِ تبسم" صدیق بکڈپو نے لہٰذا چوتھا مجموعہ "طوفانِ تبسم" اور "گہرستان" ہم نے خود چھاپ لے طوفانِ تبسم کے لیے بھی برادر محترم مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے سرمایہ کا انتظام ایک ایسے بزرگ کے یہاں سے کرا دیا۔ جن کی پہلی شرط یہی تھی۔ کہ اس کے نام اچھالا نہ جائے۔ مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے ہماری

تعمیری زندگی میں بہت کچھ ہاتھ بٹانا چاہا۔ اور بہت کوشش کی کہ ہم کسی طرح اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ مگر وہ بیچارے کیا کرتے۔ ع

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی

چنانچہ کہرستان اور طوفانِ تبسم کی اشاعت کے بعد اگر ہم آدمیت سے کام لیتے۔ تو ایک چھوٹا سا بک ڈپو اپنا ذاتی ہو سکتا تھا۔ اور اب تک جو پچیس تیس کتابیں دوسرے ناشروں نے چھاپی ہیں۔ وہ ہم خود چھاپتے اور بچوں کے لیے کوئی مستقل سامان کر دیتے۔ مگر یہاں تو مقولہ یہ تھا کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ شرافت اسی وقت تک ساتھ دیتی تھی جب تک روپیہ ساتھ چھوڑے رہتا تھا۔ اور جہاں جیب میں کچھ آیا۔ بس یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح یہ صرف ہو۔ گر جائے۔ کوئی چرا لے۔ کوئی مانگ لے۔ مختصر یہ کہ ہمارے پاس سے جائے۔ آج کل پھر ذرا کم بختی کا دورہ ہو رہا تھا اور شامتیں دور دور سے گھیرنے چلی آ رہی تھیں۔

پھر وہی تلاش اور وہی ہم

کوئی نہ کوئی کاروبار ہونا چاہیے تھا۔ یا یوں کہیے کہ کاروبار وہ کرے جو بیکار رہے ہم خدانخواستہ بیکار تو تھے نہیں کہ خواہ مخواہ بک ڈپو وغیرہ کھولتے پھرتے مقصد تو پیسہ لگانے سے تھا۔ اور منافع کمانے سے تھا۔ لہٰذا ہم نے سب سے زیادہ چلتا ہوا کاروبار تاشوں کو سمجھا۔ اس کاروبار کا نتیجہ فوراً معلوم ہوتا ہے یعنی یا تو وارے

نیارے ورنہ ہارے تو بھاگے نا نیارے رہ گیا کہ افیونیوں کی طرح بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ کب ڈاکیہ آکر قسمت کا فیصلہ سناتا ہے۔ کہ تمہارے اتنے وی، پی وصول ہوئے اور اتنے واپس آگئے۔ اس لغویت میں مبتلا ہونے کی بجائے ہم نے پھر تاش کھیلنا شروع کر دیئے۔ اور جو تھوڑا بہت سرمایہ تھا۔ وہ اس کاروبار میں لگا دیا۔ دیکھیے کاروبار خواہ کوئی بھی ہو۔ اس کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ نفع یا نقصان۔ بڑی بڑی سرمایہ دار کمپنیاں بغیر تاش کھیلے فیل ہو جایا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے ملک التجار اپنا دیوالہ نکلوا دیتے ہیں۔ اور اگر نفع ہونے والا ہوتا ہے۔ تو مٹی اٹھا لیجیے سونا بن جائے چنانچہ ہم تو اس سلسلہ میں تدبیر سے زیادہ تقدیر کے قائل تھے۔ اور تقدیر کی آزمائش کا موقعہ جس قدر تاشوں میں حاصل ہوتا ہے۔ اتنا کسی اور کاروبار میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاش کھیلنے کے سلسلہ میں ہماری اس تجدید کا جشن احباب نے منایا لوگ یکجا ہوئے۔ نئے نئے چکنے چکنے تاش منگائے گئے۔ اور ہم پھر اسی مشغلہ میں ڈوب کر رہ گئے۔ کاروبار میں تو نفع اور نقصان کا چولی دامن کا ساتھ ہے کبھی اچھی چاندی ہو جاتی تھی اور کبھی کسی معاملہ میں خسارہ۔ دراصل تجارتی دنیا اسی جوار بھاٹے پر قائم ہے۔ اور تاشوں کے سلسلہ میں تو نہایت مشاق قسم کے کاروباری آدمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو نہ جوار دیکھے نہ بھاٹا۔ بس استقلال کے ساتھ ان تھپیڑوں سے کھیلتا رہے ڈوبتا رہے۔ ابھرتا رہے۔ جو ڈوبے گا وہی موتی نکالے گا۔ اور جو ابھرنے کے بعد پھر ڈوبنے سے ڈرا یہ سمجھ لیجیے کہ

پھر وہ ڈوبا ہمیشہ کے لیے۔ روپیہ پیسہ کیا ہے۔ ہاتھ کا میل۔ دولت یعنی دولاتوں والی چلتی پھرتی چیز۔ ان چیزوں کا کیا بھروسہ۔ قارون نے جمع کیا تھا تو کیا پایا۔ حاتم نے صرف کیا تھا۔ آج تک نام ہے۔ اصلی چیز تو دل ہے۔ بس دل بڑا ہونا چاہیے انسان کا۔ انشاء اللہ زندگی بھر رفاقت کرے گا۔ خصوصاً ایک تاش کھیلنے والے کا دل تو اتنا بڑا ہونا چاہیئے کہ اس پر گرم و سرد دونوں کا اثر نہ ہو۔ اگر جیتنے سے زیادہ خوش ہو گیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہارنے کی تاب لا ہی نہ سکے گا۔ اور ہار کر اگر بہت بے دل ہو گیا۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ ہار سے ڈر کر رہ جائے گا۔ اور بازی لگانے کے لیے جس جسارت کی ضرورت ہے وہ اس غریب میں کبھی پیدا نہ ہو سکے گی۔ دراصل تاش کے تمام لطف کا راز وہ خطرہ ہے جو بازی لگا کر کھلاڑی حاصل کرتا ہے۔ اس خطرے میں پڑ کر ناکامی سے ڈرنا ہی نہ چاہیئے اس لیے کہ ناکامی اس خطرے سے زیادہ خطرناک تو ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اگر کامیابی ہو گئی تو انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس نے وہ کام کیا ہے جو رستم سے نہ ہو گا۔ پھر یہ کہ اسی تاش کی بدولت انسان کو زندگی کے وہ قیمتی تجربے حاصل ہوتے ہیں، جو کسی اور صورت سے کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔ کسی دوست کو پرکھنا ہو ساتھ میں تاش کھیلا کر داؤ لگا کر پرکھ لیجئے۔ اپنے چہرے سے نقاب ہٹا کر اصلی خد و خال میں آپ کے سامنے آجائے گا۔ بڑے بڑے یاران وفا طوطے کی طرح وقت پڑ جانے پر آنکھ بدل لیا کرتے ہیں۔ مگر خدا نہ کرے کہ آپ پر وقت پڑے بغیر

وقت پڑے ہی اگر تجربہ کرنا ہے تو کسی دوست سے تاش کھیل کر دیکھ لیجئے۔ خواہ کتنا مکمل انسان کیوں نہ ہو۔ ایسا لاجواب جلوطا ثابت ہوگا کہ آپ خود ہی جی بھیجو لب لینے لگیں۔ اس سلسلہ کے بے شمار تجربات میں سے صرف ایک یہاں بیان کرنے کو دل چاہتا ہے۔ تاکہ ہم کو بھی کوئی ناتجربہ کار نہ کہہ سکے۔ رفیع احمد خاں صاحب کے اور ہمارے ایک مشترک دوست جن کی ہمہ گیر قابلیت سے ہم سب ہی قائل تھے۔ اور جن کو ہم واقعی دوست جانتے تھے بلکہ جو اب تک ہمارے دوست ہر وقت کے ہمنشین اور ہر دکھ درد کے شریک ہیں۔ ایک رات کھیل میں شریک ہوئے۔ صبح ہم کو دہلی روانہ ہونا تھا۔ اس لیے کہ دوسرے دن دہلی سے براڈکاسٹ کرنا تھا۔ اس رات حالات اس قدر ابتر ہوئے کہ ہم فالتو روپے کے علاوہ دہلی کا کرایہ تک ہار گئے۔ اور ہمارے یہ دوست جیتے۔ کھیل کے اختتام پر ہم نے رفیع احمد خاں کے سامنے ان عزیز دوست سے عرض کیا آپ مجھ کو اس جیتے ہوئے روپے میں سے اتنا روپیہ قرض کے طور پر دے دیجئے۔ میں دہلی سے آتے ہی ادا کر دوں گا۔ معلوم یہ ہوا کہ گویا آپ سے کبھی کی جان پہچان ہی نہیں سے صاف انکار کر دیا۔ رفیع احمد خاں کو ان کے اس انکار پر ان سے زیادہ غصہ ہم پر آ رہا تھا۔ کہ ہم نے آخر ان سے روپیہ کیوں مانگا۔ رفیع احمد خاں کے متعلق ہم کو معلوم تھا کہ وہ بھی ہارے ہیں۔ لہٰذا ان سے طلب کرنے کا سوال ہی نہ تھا آخر ہم کو اسی وقت گھر جانا پڑا حالانکہ گھر پر سب کو یہ معلوم تھا کہ ہم رات ہی کی گسٹی لینا

سے دہلی روانہ ہو گئے ہیں۔ اور واقعی یہ رات ہم نے تاش کھیلنے کے لیے چرا لی تھی۔ گھر جا کر بٹوہ نکل جانے کا ایک افسانہ سب کو سنایا۔ اپنی رات بھر کی پریشانی کا ذکر کیا۔ اور روپیہ لے کر پھر دہلی روانہ ہو سکے۔ ہمارے یہ دوست آج بھی ہمارے بیحد شرمسار ہیں۔ جہاں ہمارا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہا دیں گے۔ مگر جو کچھ ہوا تھا وہ ہم لکھ ہی چکے ہیں۔ ہم نے اپنے ان دوست سے پھر کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی۔ مگر یہ بات ہمارے دل پر اس قدر گہری نقش ہو چکی ہے کہ اگر ہم خود اس کو بھلانا چاہیں تو کبھی نہیں بھلا سکتے۔

تاشوں کی دق

تاشوں کی دق۔ دق کی بے شمار قسموں میں سے ایک تندرست قسم کی دق ہے۔ جس کے جراثیم پھیپھڑوں پر زخم نہیں ڈالتے۔ بلکہ پرس اور جیب کو چھلنی کر دیتے ہیں۔ ہم اس دق کے تیسرے نہیں بلکہ شاید بیسویں پچیسویں درجہ میں مبتلا تھے۔ اور ہمارے صحت یاب ہونے کی اب کوئی امید نہ تھی۔ معلوم نہیں کس کس کے مقروض تھے۔ گھر سے کیا کیا بہانے کر کے روپیہ لاتے تھے اور سب ان ہی تاشوں کی نذر کر دیتے تھے۔ دنیا کا کوئی اور شوق تھا ہی نہیں مرض اس لیے بڑھا ہوا تھا کہ بیوی سے چوری تھی۔ اگر کھلم کھلا کھیلتے ہوتے تو شاید اتنی چوریاں کرنا نہ پڑتیں۔ اور نہ گھر سے اس قدر غائب رہتے۔ ہم خود جانتے

تھے کہ ہماری زندگی میں یہ گھن لگ چکا ہے۔ ہم کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہم اس علت میں مبتلا نہ ہوتے تو ہمارے لیے ترقی کے امکانات موجود تھے۔ اور اب بھی اگر تائب ہو جائیں تو ترقیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں مگر سنجیدگی سے بار بار کوشش کرنے کے باوجود پھر اپنے کو اسی بلا میں گرفتار پاتے تھے۔ اور اس کا کوئی علاج اب تک ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کا کوئی ناگوار اثر دماغ پر نہیں پڑ رہا تھا اور ہم بے حیائی کی عمر دراز، اسی طرح بشاش اور خوش تھے۔

مرزا عالمگیر قدر

آپ بھی یہ شیخ احمد خاں صاحب کے یہاں تاشوں کی گڈی سے برآمد ہوئے تھے۔ ابھی مکمل ملاقات بھی نہ ہونے پائی تھی۔ کہ نہایت شفقت سے عزیزم اور صاحبزادے وغیرہ کہہ کہہ کر اپنی بزرگی کا سکہ ہم پر بٹھا دیا اور لیکچر شروع کر دی۔ وہی بزرگانہ ڈانٹ ڈپٹ۔ پند و نصیحت۔ ہر شخص کے ہر معاملہ میں دخل۔ ہر بات میں آپ کی طرف سے ایک قول فیصل۔ ہر بحث پر معلومات کا ایک دریا بہائے دیتے ہیں۔ شعر سنائیے تو شعر آپ کا ہوگا اور مفہوم وہ بیان فرمائیں گے۔ لباس پہنئے۔ تو اس کے تانے بانے سے لے کر خیاط کی سوئی تک پر ایک مکمل تبصرہ فرما جائیں گے۔ بیمار پڑیئے تو ڈاکٹر نسخہ لکھے گا۔ علاج آپ کریں گے کسی کے یہاں ولادت

ہو تو دائی کو طلب کر کے ضروری مشورے آپ دیں گے۔ حالانکہ سوائے اس کے
کہ آپ خود تو پیدا ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی اور کوئی معلومات آپ کو نہیں ہے۔ کسی
کو چھینک آئی۔ اور آپ نے اس کے مستقبل پہ ایک دھواں دھار تقریر فرمادی
کہ اب اس کو رات کے بھیگتے بھیگتے ٹمپریچر ہو جائے گا۔ صبح تک اختناق الرحم
کے دورے پڑنے لگیں گے۔ پھر انسائیکلو پیڈیا ہو جائے گا۔ اور اگر اس نے سناٹوجن
کے انجکشن نہ لیے تو کل شام تک اسی وقت اس کے پسینہ سے شکر آنے لگیگی اور
دماغ میں فیل پا پیدا ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ دراصل اس کو کانسٹیٹی
ٹیوشنل کی شکایت ہے میاں۔ اس کا علاج جم کر کرو ایسا نہ ہو کہ اس کے پیروں میں پائیریا
کی شکایت پیدا ہو جائے۔ اسی مرض میں سینکڑوں آدمیوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے
کچھ پتہ نہیں چلا کہ لارڈ کچنر مر کے ڈوبے یا ڈوب کے مرے۔ رفیع احمد خاں اور ہم
سب حیرت سے ان کا منہ دیکھتے تھے۔ اور وہ اپنی تمام سنجیدگیوں کے ساتھ اس
علمی عقدے کو سلجھاتے اور ہم سب کو اپنی قابلیت سے الجھاتے چلے جاتے
تھے۔ ہر فن میں مہارت کا یہ عالم کہ کوئی ماہر موسیقی آگیا۔ اب آپ الکے سر ہیں۔ کہ
اُستاد یہ گندھار میں جو بھیروین کی تان آجاتی ہے۔ اسے اگر مالکوس کے سروں میں
الاپا جائے تو میاں کی ٹوڈی کا اس میں آخر کیا نقصان ہے۔ یا فرض کر لیجئے کہ ترانے
میں آدھا سرگم ملہار کے طریقے پہ ہو۔ اور آدھا بلمپت اور درت دونوں کے حاصل
ضرب سے اڑانے کے طرز پہ رکھا جائے تو کیا ٹھکانہ ہوگا۔ ماہر موسیقی اپنا ساز اٹھا

کر اپنے سر پر اپنے پیر رکھتا۔ اور بھاگتا وہاں سے۔ اب آیا کوئی شاعر اور شامت اعمال سنا دیا۔ اس نے اپنا کلام۔ بس پہلا ہی مصرعہ سن کر ایک دم اُچھل پڑے "میاں ٹھہرو کس قدر نازک بات کہہ دی ہے تم نے اب اس پر دوسرا مصرعہ لگاؤ گے تو پتہ چلے گا کہ کیسے لوہے کے چنے چبانا پڑتے ہیں۔ ذرا پھر پڑھو اس مصرعہ کو۔ ع

رات گذری نور کا تڑکا ہُوا

کیا بات کہہ دی ہے۔ رات گذر ہی نہیں سکتی جب تک نور کا تڑکا نہ ہو اور نور کا تڑکا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ رات گذر نہ جائے۔ پھر نور کا تڑکا کہا ہے اگر کہیں تڑکے کا نور کہہ دیتے تو مصرعہ پھسپھسا ہو کر رہ جاتا۔ مختلف پہلو نکالے ہیں۔ اس مصرعہ میں اور پھر ردیف "ہُوا" اس قدر استحکام اور انتظام کے ساتھ رکھ دی ہے۔ کہ ہلائے نہ ہلے۔ پھر قیامت یہ رکھی ہے کہ ترتیب کس قدر پاکیزہ ہے۔ اگر اسی مصرعہ کو یوں کہتے کہ۔ ع۔

نور کا تڑکا ہُوا اور گذری رات

تو واقعہ کے اعتبار سے مصرعہ مہمل ہو جاتا۔ اس لیے کہ پہلے رات گذرتی ہے بعد میں نور کا تڑکا ہوتا ہے۔ لہٰذا ناظم نے یوں نہیں کہا ہے۔ بلکہ پہلے رات گذاری ہے کہ رات گذری پھر نور کا تڑکا پیدا کیا ہے۔ کہ نور کا تڑکا ہُوا کس قدر ہموار ہے دونوں ٹکڑے ہیں۔ اور کیسے دست و گریباں۔ کوئی لفظ بیچ سے ہٹا

دیجئے مصرعہ ناموزوں ہو جائے گا۔ کوئی لفظ اور جوڑ دیجئے تقطیع بدل جائے گی یہ کہلاتا ہے التزام۔ انتظام۔ اور اب دوسرے مصرعہ میں جو کچھ ہو گا اس کا نام ہے انصرام۔ شاعر نے بیاض اٹھائی جوتے چھوڑے اور وہ بھی بھاگا اپنی ناک کی سیدھ میں۔ کہ شامت مارا کوئی آم والا آ گیا۔ اور آپ بیٹھ گئے اس کے ٹوکرے کے پاس عینک لگا کر اور شروع کر دیا آموں پر تبصرہ۔ کیوں بھئی یہ دسہری کی شکل کا کونسا آم ہے۔ ہے تو یہ دسہری ضرور مگر اس کی قلم میں کچھ شفتالو کا میل ہے اور اس کے پیڑ کے ارد گرد کہیں یا تو کٹھل کا درخت تھا ورنہ مالی نے قلم لگاتے وقت ادھر کی دال ضرور دکھائی تھی۔ اس کی خوشبو میں جو ایک قسم کی لہسنیت ہے وہ بغیر اس کے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور تم کو معلوم نہیں ہے کہ دسہری تمام آموں میں سب سے زیادہ نازک آم ہوتا ہے۔ اس کو لُو جب لگتی ہے اس کو تم لوگ بہت معمولی بات سمجھتے ہو۔ حالانکہ اس کو اس سے بخار ہو جاتا ہے اور خدا اپنی پناہ میں رکھے آم کے سرسام سے نہایت سخت قسم کا ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ہے کس حساب پانچ روپے ڈھیری کی تو خیر کوئی بات نہیں بلکہ اس دسہری کو دیکھو یہ جو تمہارے سامنے کچھ مضمحل سا پڑا ہے اس میں یقیناً شاہ طوطی کی آمیزش ہے وزن بھی اس کا دسہری کے عام وزن سے کچھ کم معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ تو اس کی کروٹ میں ایک جھری پڑی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس طرف کے تمام شیرے کے ریشے پھٹ کر وہ ذائقہ کو منتشر کر چکے ہوں گے خوشبو بھی کچھ نقلی سی معلوم ہوتی

ہے نہیں چھٹی نہیں یہ تو ڈھائی روپے سے زیادہ کی چیز نہیں۔ حالانکہ اگر وہ دام نہ لگاتے تو شاید وہ مفت ہی میں تمام آم یہیں الٹ کر چلا جاتا۔

ان حضرت سے واسطہ پڑا تھا۔ اور آپ نے والد صاحب مرحوم کے متعلق ایک آدھ روایت بیان کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ آپ ہمارے چچا ہیں لہٰذا ہم آپ کو نہایت ادب سے چچا کہا کرتے تھے۔ اور آپ شفقت سے زیادہ ہر وقت سرزنش میں مصروف رہتے تھے۔ آخر اس طریقہ سے تنگ آکر ہم نے ایک دن تمام احباب کے مجمع میں کہا کہ حضرات یا تو میں خودکشی کی اجازت چاہتا ہوں ورنہ ان حضرت کی بھتیجگی سے میری جان بچائیے۔ خواہ مخواہ کے یہ چچا بنے ہوئے ہیں حالانکہ ان سے کہیں بہتر چچا بننے کی صلاحیت خود مجھ میں ہے اور اگر مجھ کو ان کا چچا بننے کا موقع آپ حضرات دیں۔ تو میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھا سکوں گا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں ہر سال ایک عام انتخاب ہوا کرے۔ اور اس میں ہم دونوں میں سے جو زیادہ ووٹ حاصل کرے سو ہی اس سال کے لیے چچا بنا کیے۔ ہمارے اس بیان پر لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی کہ واقعی اس قسم کا موقع ان کو بھی ملنا چاہیئے۔ کیا تعجب ہے کہ یہ عالمگیر سے بہتر قسم کے چچا ثابت ہوں۔ چنانچہ اسی وقت عام احباب کو جمع کیا گیا جو موجود تھے اوّل تو وہی کافی تھے۔ کورم پورا تھا۔ مگر معاملہ چونکہ نازک تھا۔ لہٰذا پورے ہاؤس کے سامنے پیش ہوا۔ اور دوسرے دن انتخاب کا وقت مقرر کر دیا گیا تاکہ ہم دونوں

اس عرصہ میں اپنے اپنے پیے کنولسینگ کریں۔ ووٹ کے دن عجیب عالم تھا۔ کبھی عالمگیر کا پلہ بھاری نظر آتا تھا کبھی ہمارا۔ کبھی ہمارے ووٹ ٹوٹ کر ادھر ہو جاتے تھے۔ کبھی ان کے ووٹ ٹوٹ کر ہماری طرف آجاتے تھے۔ آخر رائے شماری کا وقت آیا۔ رفیع احمد خان پولنگ آفیسر مقرر ہوئے۔ باقاعدہ ووٹ پڑنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں پولنگ آفیسر نے نتیجہ سنا دیا۔ ہم کو تیرہ میں سے نو ووٹ ملے تھے عالمگیر کو تین اور ایک ووٹ مشکوک ہو کر مسترد کر دیا گیا۔ عالمگیر نے اعلان سنتے ہی چچا کہہ کر ہم کو آداب کیا اور ہم نے شفقت کے ساتھ اُن کے سر پہ ہاتھ پھیر دیا۔ لوگوں نے ہم کو مبارکباد دی اور ہم نے شکر گذار ہو کر کہا کہ دعا کیجئے کہ میں صحیح معنوں میں چچا ثابت ہو کر اس کی کچھ اصلاح کر سکوں

اے۔ آئی۔ سی۔ کلب لکھنؤ

رفیع احمد خان صاحب کوآپریٹو سوسائٹیز کے دفتر میں ہیڈ اسسٹنٹ تھے۔ اور دفتر کے بعد وہیں دفتر کے پختہ کورٹ میں ٹینس کھیلا کرتے تھے۔ ٹینس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں ایک کلب کی بنیاد پڑی۔ جس کا نام انگریزی میں اے۔ آئی۔ سی۔ کلب رکھا گیا۔ اس کا واضح کرنا تو خیر ہمارے امکان میں نہیں ہے۔ البتہ نام کا ترجمہ یہ ہوا۔ آل انڈیا کوآپریٹو انجمن حماقت مآبان لکھنؤ

اِس کلب کے صدر مدتوں سے محمد احمد صاحب چلے آرہے تھے اور طے یہ تھا کہ جس دن کوئی اور صاحب ان سے بڑھ کر اِس منصب کے لیے اپنے استحقاق کا ثبوت دینا شروع کریں گے۔ اُسی دن کلب کے ممبروں کی تائید حاصل کرکے اِس عہدہ پر آجائیں گے چنانچہ خدا نے باقی تو سب کو بچا یا مگر حکیم محمد نذیر صاحب آخر کار اتفاق رائے سے صدر ہو گئے۔ اِس کلب کی ممبری کے لیے یہ ضروری تھا کہ ممبر یوں چاہیے جیسا بھی تیز طرار ہو۔ ذہین اور طباع ہو مگر اس میں شئے لطیف کی کسی نہ کسی حیثیت سے کمی ضرور ہو چنانچہ اِس کلب میں ہمارے داخلہ کا قصہ یہ ہوا کہ ہم شام کے وقت بغیر روشنی کے بائیسکل پہ جا رہے تھے کہ راستہ میں ٹریفک پولیس کے ایک کانسٹیبل نے روک لیا۔ اور ہم سے بائیسکل رکھوالی۔ اور کہا کہ آپ کسی شخص کو لائیں جو شناخت کرکے یہ بتادے کہ آپ نے نام اور پتہ صحیح لکھوایا ہے۔ ہم فوراً اخبان صاحب کے دفتر پہنچے۔ اس لیے کہ ٹینس ختم کرکے یہ حضرات کچھ دیر غپ شپ کیا کرتے تھے اور ان سے اس حادثہ کا ذکر کیا۔ سب کے سب فوراً ہمارے ساتھ وہاں تک گئے۔ مگر وہاں نہ بائیسکل تھی نہ کانسٹیبل۔ ہم سے پوچھا کہ کانسٹیبل ڈیوٹی پر تھا یا گشت کر رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم کو پتہ نہیں۔ البتہ اس نے ہم کو بہیں روک کر نام اور پتہ لکھا تھا۔ بلکہ وہ تو وردی میں بھی نہ تھا۔ اب تو یہ حضرات چونکے۔ کوتوالی جا کر تحقیقات کی مگر وہاں بھی پتہ نہ چلا۔ مجبوراً رپورٹ لکھوادی اور دوسرے دن

ہم اس کلب کے مستقل طور پر ممبر چن لیے گئے۔ بائیسکل چھوٹ سکی۔ اور نہ اس کلب کی ممبری سے ہم علیحدہ ہو سکے۔ کلب کے باقی تمام ممبر بھی اسی قسم کے کسی نہ کسی قسم کے ماتحت ممبر بنے تھے۔ خود رفیع احمد خاں بھی ممبر تھے۔ اور خدا کے فضل سے ممبروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اور کلب ترقی پر تھا۔ کہ کسی دفتری مصلحت کی بنا پر خاں صاحب کو وہاں کی ٹینس ترک کرنا پڑی۔ اور اسی سلسلہ میں کلب بھی ختم ہو گیا مگر اس کے ممبر اب تک موجود ہیں۔ اور ان کی خصوصیات اب تک زندہ ہیں۔

یو۔ پی۔ انڈسٹریل نمائش

اسی زمانہ میں لکھنؤ میں ایک بہت بڑی نمائش کے انتظامات شروع ہوئے تمام وکٹوریہ پارک میں اس نمائش کے مختلف شعبے پھیلا دیئے گئے۔ ہندوستان بھر کے ماہرین فن اس موقع پر لکھنؤ میں یکجا ہو گئے۔ بڑے بڑے پہلوان اور بڑے بڑے ماہرین موسیقی۔ بڑے بڑے مصور۔ اور بڑے بڑے دستکار۔ اسی سلسلہ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کرنے کے انتظامات بھی شروع ہوئے۔ اور خان بہادر سید خلیل الدین صاحب ایم۔ بی۔ ای انسپکٹر جنرل رجسٹریشن یو۔ پی کو اس کا سیکرٹری بنایا گیا۔ خان بہادر صاحب کے اپنے دو اسسٹنٹ تھے۔ ایک یہ خاکسار اور دوسرے مشیر احمد صاحب علوی۔ ہم دونوں نے پورے صوبہ کا دورہ کیا۔ شعرائ سے وعدے لیے۔ نواب صاحب چھتاری سے مشاعرے کی صدارت کی

استدعا کی۔ اور کیپٹن نواب جمشید علی خاں صاحب آف باغپت کو صدر مجلس استقبالیہ بنایا۔ لکھنؤ میں ایسا ہنگامہ خیز مشاعرہ شاید ہی کوئی ہوا ہو۔ تمام اطراف ملک کے نامی شعراء موجود تھے۔ اور بیس بائیس ہزار سامعین کا مجمع تھا۔ پہلی نشست میں حاضرین نے یہ مطالبہ کیا۔ کہ باقاعدہ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل چند مخصوص شعراء کو پڑھوا دیا جائے۔ اس مطالبہ کو پورا کر دیا گیا۔ مگر اب مسلسل یہ تقاضا تھا۔ کہ مشاعرہ ان ہی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اور جس جس کو وہ چاہیں پڑھوائیں نتیجہ یہ ہوا کہ مشاعرہ میں کچھ ناگوار سی صورت پیدا ہو گئی۔ اور اس اجلاس کو چار بجے کے قریب ختم کر کے اعلان کر دیا گیا۔ کہ دوسری نشست دوسرے دن بارہ بجے سے شروع ہو گی۔ یہ دوسری نشست اس قدر کامیاب تھی کہ آج بھی لوگ اس مشاعرے کو یاد کرتے ہیں۔ مشاعرے کی اس کامیابی کے سلسلہ میں رائے صاحب برج بلبھ کشور نے دو طلائی تمغے ایک مجھے اور ایک بشیر احمد صاحب علوی کو دیئے۔ اور نمائش کے دربار میں مشیر احمد صاحب کو سند اور مجھے ایک طلائی تمغہ یوپی گورنمنٹ کی طرف سے دیا گیا۔

ہندستانی ایکاڈمی

یوپی کی ہندستانی اکاڈمی نے بھی یہ طے کیا کہ اپنا جلسہ اسی نمائش میں رکھے۔ چنانچہ [illegible] صدر ادبی انجمن کے اس جلسہ میں ہم کو بھی ایک مزاحیہ مقالہ

پڑھنے کے لیے ڈاکٹر تاراچند سیکرٹری ہندستانی اکاڈمی نے مدعو کیا۔ اکاڈمی کا یہ جلسہ مشاعرہ کے وسیع پنڈال میں ہُوا۔ اتنا بڑا پنڈال اور ملک میں محدود قسم کا ذوقِ ادب۔ پھر خیال غالباً یہ بھی ہوگا کہ یہ جلسہ محض ادبی نہیں بلکہ علمی بھی ہوگا۔ لہٰذا نمائش کے دیکھنے تماشوں کو چھوڑ کر بھلا کون اس علم و ادب کی طرف متوجہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ پنڈال کے ایک گوشہ میں دس پندرہ آدمی جلسہ کرنے بیٹھ گئے مگر وہ دس پندرہ اس قدر بھاری بھرکم لوگ تھے۔ کہ ان میں کا ہر شخص اپنے اقتدار اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے بیس پچیس ہارس پاور سے کم کا نہ تھا۔ مثلاً سر تیج بہادر سپرو، سر سید لیاقت علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی۔ ڈاکٹر تاراچند وغیرہ۔ اسی مختصر سے جلسہ میں مگر ان ادبی پہاڑوں کے سامنے اس ذرّۂ بے مقدار نے بھی اپنا مقالہ پڑھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ہر فقرہ پر حوصلہ افزائی فرما رہے تھے۔ اور سر سپرو کے متعلق قطعاً یاد نہیں کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ مگر اس جلسہ میں بھی سر سیّد لیاقت علی وہی بھوپال والے چچا لیاقت علی بنے بیٹھے تھے۔ یعنی آنکھوں سے تحسین و آفرین کے بجائے شفقت برس رہی تھی۔

سگ بازی

آپ نے مرغ بازی اور بٹیر بازی وغیرہ سُنا ہوگا۔ مگر ہم کو ان میں سے

تو کسی سے شوق کبھی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ پتنگ بازی میں بھی ہمیشہ کورے رہے مگر اب سگ بازی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ لکھنؤ کی نمائش میں جہاں اور چیزیں تھیں وہاں گرے ہاؤنڈ ریس بھی تھی۔ اور کتوں کی یہ دوڑ بالکل گھوڑ دوڑ کے اصول پر ہوتی تھی نمائش کے ساتھ اس کے تمام کھیل تماشے ختم ہو گئے مگر کتوں کی دوڑ میں جاتے تھے۔ بازیاں لگاتے تھے۔ اور اس شوق کے پیچھے تاش تک کو چھوڑ رکھا تھا۔ شیخ احمد خان۔ عالمگیر۔ یوسف مرزا۔ اور نواب زادہ خلیل اللہ خان گویا گروپ تشکیل ہوتا تھا ہمارے دوستوں کا۔ چنانچہ ہم بھی جانے لگے۔ اور سب کے ساتھ بازیاں لگانے لگے۔ کبھی جیتے کبھی ہارے۔ مگر ایک مرتبہ تو کمال ہی ہو گیا۔ ایک کتے کے متعلق معلوم ہوا کہ یہ بجلی کی طرح اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ کر یقینی طور پر ریس جیت لے گا۔ ہم سب نے اس کتے پر داؤ لگا دیا۔ کتا واقعی برق بلا تھا۔ چھوٹتے ہی جو تیر کی طرح چلا ہے تو باقی کتے اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ تھوڑی دور تک تو وہ اسی طرح چلا آیا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ کھڑا ہو گیا۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک مرتبہ دم ہلائی۔ پھر آپ کچھ سوچے۔ اور پھر جانے کیا طے کر کے واپس لوٹ گئے۔ خیال تھا کہ دوسرے کتوں کو دوڑتا ہوا دیکھ کر شاید آپ پھر دوڑیں مگر آپ سیدھے اپنے ٹھکانے میں چلے گئے۔ اور ہم سب کا دیوالہ نکلوا دیا۔ کتوں کی اس دوڑ کے سب سے بڑے ماہر عالمگیر تھے۔ جس طرح وہ ہر فن میں پیش پیش تھے انسانی کے ساتھ ماہر ہو جایا کرتے ہیں۔ کتوں کے عالم حالات تھے۔ ان کی عادات

ان کی نسلی کیفیت۔ ان کے اطوار اور ان کے امراض سب پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔ جس وقت دکھائی کے لیے کتے سامنے لائے جاتے تھے آپ ان پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہی فوراً بتا دیا کرتے تھے۔ کہ اس کتے میں شرافت کا کتنا خون ہے۔ اور اس کتے کی تعلیمی حالت کس قدر ہے گرے ہاؤنڈ ریسنگ کا پورا ریکارڈ آپ کے پاس محفوظ تھا۔ ہر روز ریس کی کتاب لے کر آپ تمام پرانے ریکارڈ کی گویا پوری اسٹڈی فرماتے تھے۔ در پھر ایک باقاعدہ اسکیم سے کر ریس میں جایا کرتے تھے۔ کہ اس میں اتنے ٹکٹ خود ضرور خریدیں گے۔ اتنے ٹکٹوں میں دوسروں کے شریک ہوں گے اور احباب کو یہ مشورہ دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم سب سے زیادہ جیت میں وہی رہتے تھے مگر ان کے مشوروں پر چلنا ہمارے امکان میں اس لیے نہ تھا۔ کہ اصول کے ماتحت ممکن ہے کہ جیت تو جائیں مگر یہ احساس کہ ہم عالمگیر کے مشورے پر چلے ہیں مشکل سے پنپنے دے گا۔ اس سلسلہ میں ایک اور تاریخی واقعہ یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ہم ترپن روپے ہارے ہوئے تھے۔ اور آخری دن جب اس ریس کو سرکاری طور پر ختم کیا جا رہا تھا۔ بالکل آخری ریس میں ہم نے ایک ڈبل ٹوٹ کا ٹکٹ سب سے الگ ہو کر تنہا خریدا۔ اور وہی ٹکٹ جیتا۔ اس میں ہم کو ترپن روپے ہی ملے۔ لکھنؤ سے یہ ریس کلکتہ چلی گئی۔ ہم لوگ تو صبر کر کے بیٹھے۔ مگر عالمگیر کلکتہ تک تشریف لے گئے

آپ نے پالتو کتوں کو تو پیچھے پیچھے آتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ مگر کتے کے پیچھے کسی انسان کے جانے کی یہ پہلی مثال گویا آپ نے قائم کی۔

سودیشی ریل کتابی صورت میں

۱۹۴۳ء میں سودیشی ریل نامی جو مضمون لکھا تھا۔ اس کی مانگ اب تک بہت زیادہ تھی۔ حالانکہ وہ چھپن مرتبہ مختلف زبانوں کے مختلف رسالوں میں چھپ چکا تھا۔ مگر اب لوگوں نے مشورہ یہ دیا کہ اس کو علیحدہ کتابی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم نے اس کو از سرِ نو ذرا وسعت دے کر لکھا۔ اور ہمارے نزدیک جو خامیاں اس میں رہ گئی تھیں ان کو دُور کر دیا۔ اس کے انگریزی ترجمہ کو بہت تلاش کیا مگر کہیں نہ مل سکا۔ آخر رفیع احمد خان نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ اور ہم نے اس ترجمہ کے ساتھ سودیشی ریل کو کتابی صورت میں پیش کر دیا۔ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن گورنمنٹ آف انڈیا نے اس پر مقدمہ لکھا۔ اور ہم نے ریل کی مناسبت سے موجودہ ریلوے ممبر گورنمنٹ آف انڈیا آنریبل چودھری سر محمد ظفر اللہ خان کے نام اس کو معنون کر دیا۔ ایک ہزار کا یہ ایڈیشن بھی ناکافی ثابت ہوا۔ اور اب بھی لوگ سودیشی ریل تلاش کرتے ہیں۔ اور ان کو اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ حد یہ ہے کہ خود ہمارے پاس اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ؟

روزنامہ حق

لکھنؤ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار نکلا کرتا تھا جس کا نام تھا حق۔ عبدالرؤف صاحب اور آپ کے برادرِ محترم علی اختر صاحب عباسی ہمارے لیے اجنبی نہ تھے۔ رفیع احمد خان کے یہاں ان دونوں حضرات سے نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ اور بار بار ملنے کے بعد ایک قسم کی بے تکلفی سی تھی۔ عبدالرؤف صاحب نے یہ طے کیا۔ کہ اپنے اخبار کو روزنامہ بنا دیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک دن ہم کو بھی یاد فرمایا۔ مقصد یہ تھا کہ ہم بھی ان کے مشوروں میں شریک ہو سکیں۔ اخبار کی پوری اسکیم سننے کے بعد ہم نے بھی کچھ مشورے دیئے اور ان کے ارشاد کی تعمیل میں ان سے وعدہ کر لیا کہ مزاحیہ کالم جس کا عنوان ہم نے خود حق کی رعایت سے "حق و باطل" تجویز کیا تھا لکھ دیا کریں گے۔ مگر وہ خود اور علی اختر صاحب عباسی اس بات پر مصر تھے کہ ہم باقاعدہ ملازمت کی صورت میں حق کی اسسٹنٹ ایڈیٹری کی ذمہ داری لے لیں ہم نے ان سے غور کرنے کے لیے وقت مانگا۔ اور پھر اپنے چند احباب سے مشورہ لیا زیادہ تر لوگوں کی یہی رائے تھی کہ ملازمت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مگر ہم نے اپنے فیصلہ سے ان کو مطلع نہیں کیا۔ بلکہ دوسرے دن خود علی اختر صاحب کا خط آیا۔ کہ فوراً آجاؤ۔ اور اپنے اخبار میں کام شروع کر دو۔ تنخواہ طے ہو ہی چکی تھی۔

ہم حق کے دفتر پہنچ گئے۔ اور ملازمت قبول کر لی۔ خبروں کا ترجمہ، حق و باطل کا لکھنا۔ اور شذرات کا لکھنا وغیرہ ہمارے سپرد ہُوا۔ اس کے علاوہ ہر روز ایک قطعہ شاعر حق کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ عبد الرؤف صاحب عباسی اور علی اختر صاحب عبّاسی کے علاوہ آپ کے والد محترم چوہدری رشید علی صاحب عباسی نہایت محبّت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ ہر وقت کے ناشتے اور کھانے پر، اگر ہم وہاں موجود ہیں تو نہایت اصرار کے ساتھ شریک کیئے جاتے تھے۔ پانوں سے ہر وقت تواضع ہوتی تھی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا بیحد خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ ہم کو ایک تکلیف بھی تھی وہ یہ کہ عبد الرؤف صاحب عبّاسی کے ایک چچازاد بھائی بھی عملۂ ادارت میں تھے اور ان کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ گویا ہم براہ راست ان ہی کے ملازم ہیں عجیب شعلہ مزاج اور آتش زیر پا فطرت پائی تھی آپ نے۔ زبان کے آگے خندق بھی تھا۔ دراصل ان کو یہی بات ناگوار تھی کہ جو شخص ملازم ہے اس کے ساتھ عزیزانہ برتاؤ کیوں ہو رہا ہے۔ خیر ان سے ڈرنے کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر ڈر معلوم ہوتا تھا اس بات سے کہ کسی دن ان کی کسی بات پر بات نہ بڑھ جائے۔ خصوصًا ایسی حالت میں جب کہ عبد الرؤف صاحب عبّاسی اور ان کے برادر محترم بھی ان کی ہر بات فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ چنانچہ صرف وہی بزرگ عبد الرؤف صاحب کے تعلقات بہت سے لوگوں سے خراب کرا چکے تھے۔ اور آئے دن کسی نہ کسی سے لڑائی

کرتے رہتے تھے۔ ہم نے اس تصادم سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ اور اپنی فطرت کے خلاف بے حد ضبط اور درگذر سے کام لیا۔ ورنہ وہ تو گویا ہر وقت تصادم کے لیے تیار ہی تھے۔ دو سال تک اس تصادم سے بچے مگر آخر کار وہی حضرت اور ان کا وہی مزاج ہماری روزنامہ حق سے علیحدگی کا باعث ہوا۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ فی الحال تو ہم کو روزنامہ حق کے سلسلہ کی دوسری تفصیلات میں جانا ہے۔

پنجاب کا دوسرا سفر

روزنامہ حق کی ملازمت ہی کے درمیان ہم کو پھر قادیان جانا پڑا۔ لکھنؤ میں احمدیت کے خلاف جو پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اسی سلسلہ میں مولوی محمد عثمان صاحب احمدی نے "حقیقت" کے ایڈیٹر انیس احمد صاحب عبّاسی کو اور اس خاکسار کو دعوت دی کہ آپ لوگ قادیان چل کر وہاں کے حالات کا خود مطالعہ کریں۔ اور اپنے اس مطالعہ کی روشنی میں اگر مناسب سمجھیں تو کچھ لکھیں۔ انیس احمد صاحب عبّاسی نے اور ہم نے علیحدہ مشورہ کیا۔ اور آخر اس دعوت کو منظور کر لیا۔ انیس صاحب کے ساتھ ریل کا سفر نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ کی سفری گھبراہٹیں۔ اور اگر کوئی کسی سے کسی قسم کا مذاق کرے تو آپ کی سراسیمگی قابلِ دید ہوتی ہے۔ اس تمام سفر میں آپ کو یہ انتظار رہا کہ کب اس شوکت کی وجہ سے

کسی مسافر سے فوجداری ہوتی ہے۔ اور کب کسی مذاق کے سلسلہ میں شوکت کے ساتھ خود ان کی گت بنتی ہے۔ مگر شکر ہے کہ اس کی نوبت نہ آسکی۔ اور انیس احمد صاحب کی ٹوپی اچھلنے کا تو کیا ذکر ہے۔ ٹوپی اترنے تک کا موقع نہ آسکا۔ البتہ رات کو جب وہ بے خبر سو گئے تو خود ہم نے ٹوپی ذرا سی کھسکا کر دیکھی۔ کہ آخر سر میں کیا نقص ہے کہ یہ ٹوپی کبھی اتارتے ہی نہیں۔ مگر ہماری سمجھ میں کوئی بات نہ آسکی

اس مرتبہ قادیان پہنچ کر ہم لوگوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ ہر شعبہ کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ خود حضرت صاحب سے ملے۔ اور دعوت بھی ان کے ساتھ کھائی۔ ہمارے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا گیا۔ اسکول کو دیکھا۔ اور حضرت صاحب کے کل سیکرٹریٹ کی سیر کی۔ جہاں ہر ایک شعبہ کا ایک علیحدہ ناظم تھا۔ اور جتنے ناظم تھے وہ سب نہایت ایثار کے ساتھ اپنی اعلیٰ قابلیتوں کے باوجود نہایت قلیل معاوضہ پہ کام کر رہے تھے۔ برادر محترم مولوی محمد عثمان صاحب نے ہم دونوں کی تواضع اور آرام کا ہر ممکن انتظام ہر جگہ کیا۔ اور آخر ہم سب ایک رات قیام کر کے وہاں سے واپس ہوئے۔ انیس احمد صاحب سیدھے لکھنؤ آگئے۔ اور مولوی محمد عثمان صاحب اور ہم لاہور آگئے۔ اس مرتبہ بھی ہم لوگ لاہوری احباب سے ملے۔ حکیم یوسف حسن صاحب اور ان کے رفیق کار سید فرید جعفری جو اس زمانہ میں نیرنگ خیال کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اپنے پر تکلف دستر خوان پہ ہم کو ملے۔ ساتک صاحب اور اسلم صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ سید امتیاز علی تاج سے ملے۔ اور لاہور

کی اس دوسری سیر کے بعد اپنے کو لاہور کا اور بھی تشنہ بنا کر واپس آ گئے۔

دوستانہ ملازمت

عبدالرؤف صاحب عباسی اور علی اختر صاحب عباسی سے دوستانہ تعلقات پہلے سے تھے۔ اور ملازمت بعد میں شروع کی تھی۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں دوستی ختم نہ ہو جائے اور صرف خادم اور آقا کے تعلقات نہ رہ جائیں مگر یہ صورت نہ ہو سکی۔ بلکہ دوستانہ تعلقات سے عزیزدارانہ تعلقات کی صورت اختیار کر لی۔ یہی وجہ تھی کہ عباسی صاحب کے ان عزیز کا طرز عمل ناگوار ہوتا جاتا تھا۔ ورنہ حال تو یہ تھا کہ دفتر میں کام کے وقت بھی دوستانہ باتیں ہوتی رہتی تھیں اور بعد میں بھی ہم سب کی تفریحات مشترک تھیں وہ اپنے وطن کاکوری جا رہے ہیں اور مصر ہیں کہ شوکت بھی چلیں سینما جا رہے ہیں اور ہم ساتھ ہیں کسی جلسہ میں جا رہے ہیں اور ہمارے بغیر چلتے نہیں مختصر یہ کہ نہایت خوشگوار مراسم تھے۔ آپ کے ایک اور عجیب الخلقت عزیز اسی زمانہ میں تشریف لے آئے اور روزنامہ حق کے شعبہ انتظام میں تھوڑا بہت کام کرنے لگے یہ حضرت گویا ہم سب کے لیے عجیب تفریحی سامان تھے۔ ان کے ساتھ شروع میں ہم سب برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اور عباسی صاحب کے والد محترم ہم سب کی شرارتوں کو بڑی پیار کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ یوں تو گویا بڑی اچھی طرح گذر رہی تھی مگر یہاں پہ ہم بھی کھیلے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح اس کا

اندازہ آنے والے ابواب سے ہوگا۔

شب زندہ دار و صبح خیز

ہم اُس زمانہ میں پھر اپنے ذاتی مکان زرد کوٹھی میں رہتے تھے۔ جو وکٹوریہ اسٹریٹ پر ہے۔ اور روزنامہ حق کا دفتر ہیوٹ روڈ پر مقبول گنج میں تھا۔ یہ فاصلہ تین میل سے کم نہ ہوگا۔ حق صبح تڑکے نکلتا تھا۔ اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ تمام مقامی اخبارات سے پہلے بازار میں پہنچ جائے۔ چنانچہ اس کے خبروں کے ضمیمہ کو مرتب کرنے کے لیے ہم کو چار بجے صبح دفتر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ صبح چار بجے دفتر پہنچنے کے لیے ہم رات کو تین بجے بیدار ہوتے تھے اور ضروریات سے فارغ ہو کر بائیسکل پر دفتر جایا کرتے تھے۔ کوئی موسم ہو۔ کیسے ہی حالات ہوں۔ مگر ہم کو اسی وقت چلنا پڑتا تھا۔ دسمبر کی قیامت خیز سردی میں لحاف سے جس قسم کے مراسم ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ دسمبر کی کسی رات کو لحاف سے نکل کر کیجئے گا۔ مگر ہم کو اسی زمانہ میں لحاف چھوڑنا پڑتا تھا۔ اور ساڑھے تین بجے کے قریب کانوں پر مفلر لپیٹ کر اور شیروانی پر موٹا سا چسٹر پہن کر ہم دفتر جایا کرتے تھے۔ سڑکیں ویران ہوتی تھیں۔ اور راستہ میں ایک آدھ ایسی جگہ بھی آتی تھی۔ جہاں آسانی سے لوٹ مار ہو سکتی ہے۔ بلکہ جہاں اس قسم کا ایک آدھ واقعہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ مگر ہم کو اطمینان تھا کہ ہم سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ اور اگر پوچھا تو

کہہ دیں گے کہ بھائی تم تو غور کرو۔ کہ ایک ایسے شخص کے پاس تم کو کیا مل سکتا ہے جو اپنی ضروریات سے اس قدر مجبور ہو۔ کہ اس وقت اور اس موسم میں کام پہ جا رہا ہو

ایک کُتّے نے مزاج پُوچھ لیا

کسی آدمی نے تو خیر ہم سے اس قسم کا کوئی سوال نہیں کیا۔ مگر ایک رات جب ہم جسٹر میں لپٹے وستانے چڑھائے۔ گلو بند میں چھپے بائیسکل کے غراٹے بھرتے چلے جا رہے تھے ایک کُتّے نے ہم کو ٹوکا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ روزہ ہی کتّے پوچھا کرتے تھے۔ اور ہم رعیت کہہ کر نکل جایا کرتے تھے۔ مگر یہ کتا شاید نیا نیا تبدیل ہو کر آیا تھا۔ دُور ہی سے ہم کو دیکھ کر اس نے ٹوکنا شروع کر دیا۔ مگر جب یہ دیکھا کہ یہ شخص سرکشی سے کام لے رہا ہے اور حکم نہیں مانتا۔ تو ایک مرتبہ جھپٹ کر اس زور سے ہم کو گھسیٹا ہے کہ ہم معہ بائیسکل کے سڑک کے بیچوں بیچ نہایت اطمینان سے استراحت فرما رہے تھے۔ اور کتا دُور کھڑا ہوا اب تک ہم کو ڈانٹ رہا تھا۔ بمشکل تمام اس کو وہاں سے بھگایا۔ اور اب جو گرد وغیرہ جھاڑتے ہیں تو پتہ چلا کہ جسٹر کا ایک دامن جسٹر سے نہ صرف علیحدہ ہو کر لٹک رہا ہے۔ بلکہ اس کا ایک حصہ وہ کتا نوچ کر لے گیا ہے۔ اس روز سے ہم نے بجائے اپنے ساتھ ٹارچ رکھنا شروع کر دی۔ اس لیے کہ کتّے بھگانے کے چند مجرب نسخوں میں سے ایک نسخہ ٹارچ بھی ہے۔

ہماری کشش

آخر کار ہماری کشش نے دفتر کو اپنی طرف کھینچا۔ اور روزنامہ حق کا دفتر بیوٹ روڈ سے منتقل ہوکر گولہ گنج آگیا۔ یہاں ایک نہایت وسیع محل مرشد آباد پیلس ہیں میں دفتر کے علاوہ اپنی رہائش اور پریس کا عبد الرؤف صاحب نے معقول انتظام کر لیا۔ اب گویا یہ جگہ ہمارے گھر سے بقدر نصف میل قریب ہوگئی۔ مگر رات کو اسی وقت اب بھی جاگنا پڑتا تھا۔ اور دفتر اب بھی اسی وقت پہنچتے تھے۔ البتہ سائیکل پر چند پیر کم مارنا پڑتے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اعزہ کے علاوہ یہ بات خود ہماری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ یہ پابندی ہم سے کیونکر ممکن ہوگئی۔ یہی ہم تھے کہ روزانہ صبح تڑکے یعنی دس بجے سوکر اٹھا کرتے تھے۔ آفتاب طلوع بھی ہوا کرتا ہے اس کی ہم کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ ناشتہ ہمارے بستر کے قریب صبح سے دس بجے تک پڑا سوکھا کرتا تھا۔ اور ہمارے نزدیک صبح کا سہانا وقت یہی دس بجے دوپہر کا وقت ہوتا تھا۔ مگر اب گویا ایک سرے سے سوتے ہی نہ تھے۔ رات کو گیارہ بجے دوستوں سے فرصت پاکر آئے اور صبح ہونے سے دو گھنٹے پہلے ہی بستر چھوڑ دیا۔ سوال تو یہ تھا کہ ہم بستر چھوڑ ہی کیسے دیتے تھے اور بستر ہم کو کیونکر چھوڑ دیتا تھا۔ والدہ صاحبہ کو ہماری اس ملازمت سے نہایت شدید اختلاف محض اسی وجہ سے تھا۔ اور باقی لوگ بھی یہی کہتے تھے کہ

صاحب یہ ان ہی کا کام ہے۔ کہ اس وقت اس طرح دفتر جاتے ہیں۔

رسالہ کائنات

عبدالرؤف صاحب عباسی نے اس نئے مکان میں آنے کے کچھ دن بعد طے کیا کہ ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کیا کہ اس کی ادارت کی پوری ذمہ داری ہمارے سر رہے گی۔ چنانچہ اس کا نام "کائنات" تجویز ہوا۔ سرورق پہ ایڈیٹری کی حیثیت سے ہمارا اور اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے آن ہی آدم بیزار عزیزہ کا نام دیا گیا۔ رسالہ کے لیے ہم نے اپنے اثر سے کام لے کر خاص خاص لوگوں کے پیغامات منگائے۔ ملک کے مقتدر ادیبوں کے مضامین جمع کیے۔ اور پہلا نمبر اس تمطراق سے پیش کیا کہ جو دیکھتا تھا داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اس رسالہ کو ترقی دینے کے لیے ہم نے عبدالرؤف صاحب عباسی کی اجازت سے کچھ سرمایہ جمع کرنے کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ مگر سوائے ایک رقم کے جو نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خان صاحب سے حاصل کر سکے۔ اور کوئی بڑی رقم ہم کو حاصل نہ ہوئی۔ البتہ وہی تین پرچوں کے بعد اس کے خریداروں کی تعداد کافی پیدا ہو گئی۔ اور رسالہ نے مقبولیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ مگر ایک طرف تو روزانہ اخبار کی مصروفیات، دوسری طرف ایک رسالہ جو خود پورا وقت اور پوری توجہ چاہتا تھا۔ آخر پانچ یا چھ نمبروں

کے بعد یہ گاڑی آگے نہ چل سکی۔ اور عبدالرؤف صاحب نے اس کو بند کر دیا حالانکہ اس کے بند ہونے کے بعد بھی اس کی مانگ برابر جاری رہی۔ اور اس کے اس قدر جلد بند ہو جانے کو عام طور پر تکلیف کے ساتھ محسوس کیا گیا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی

کائنات ہی کے سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی تجدید مراسم کی نوبت آئی۔ مولانا کے اور حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر رسالہ نگار کے درمیان نگار کی مذہبی تحریروں کے سلسلہ میں ایک تاریخی اختلاف رہ چکا تھا جس نے ایک زمانہ میں اچھے خاصے معرکہ کی صورت اختیار کر لی تھی اور مولانا سے دریابادی نے نگار کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا۔ لکھنؤ میں اس سلسلہ میں جلسے ہوئے۔ فرنگی محل میں علمائے کرام نے نگار کے خلاف عملی جدوجہد کا بیڑا اٹھایا۔ امین الدولہ پارک میں ایک جلسہ عام ہوا اور آخر کار نگار کے خلاف متفقہ طور پر یہ طے کر دیا گیا۔ کہ نگار کی ملحدانہ روش کو جاری رہنے دینا غیرت اسلامی کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ہم لوگوں نے نیاز صاحب شیخ پوری کو اس حد تک راضی کر لیا تھا کہ وہ نگار کی پالیسی بدل دیں۔ ایک ادبی رسالہ کو محض ادبی رہنے دیں۔ اگر ان کے ذاتی عقائد وہی ہیں۔ جن کی وہ نگار کے ذریعہ تبلیغ کر رہے ہیں۔ تو بھی ان کو اپنی ذات تک محدود رہنے دیں۔

وہ صورت اختیار نہ کریں۔ جس سے عام مسلمانوں میں نگار کے لیے نفرت اور غصہ
کے آثار پیدا ہوں۔ جب نیاز صاحب ہم لوگوں کے اس مشورہ پر راضی ہو گئے
تو ہم نے جلسہ عام میں جو ان ہی کے خلاف ہو رہا تھا۔ اپنی ذمہ داری پر یہ اعلان
کیا کہ ہم نیاز صاحب کی طرف سے یہ یقین دلاتے ہیں کہ نگار میں اس قسم کا لٹریچر
آئندہ پیش نہ ہو گا۔ مگر اس موقعہ پر بعض حضرات نے نہایت اشتعال انگیز تقریریں
کیں۔ اور مطالبہ یہ کیا گیا کہ نیاز صاحب چونکہ عام مسلمانوں کے مجرم ہیں۔ لہٰذا
ان کو اسی جلسہ میں آکر سب کے سامنے غیر مشروط طور پر معذرت خواہ ہونا چاہیئے
اس کی مخالفت ہم نے بھی کی۔ اور اس کو بانیانِ جلسہ کی زیادتی قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ یہ کشمکش جاری رہی۔ جو اصلاحی صورت اس وقت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ بھی نہ
ہو سکی۔ اور محض اس تشدد کی وجہ سے اس کشمکش کا سدِ باب نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ
میں حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے ہم کو بھی نیاز مندوں میں
شامل سمجھ کر نہ معلوم کیا رائے قائم کر لی تھی۔ اور ان کے تمام اسکول کی رائے ہمارے
لیے غالباً یہی تھی کہ یہ بھی ایک بہکا ہوا مسلمان ہے۔ مگر اب قریب سے دیکھ کر
کچھ پڑھ کر اور کچھ سمجھ کر آپ نے اپنی رائے میں غالباً کچھ ترمیم فرمائی۔ اور
پھر نہایت شفقت سے ملنے لگے۔ رسالہ کائنات کی قلمی اعانت
فرماتے رہے۔ بلکہ شوکت کی ہر اعانت کے لیے تیار ہو گئے۔

مشاعرۂ کائنات

اسی زمانہ میں عبدالرؤف صاحب عباسی کی رائے سے ہم نے ایک مشاعرہ منعقد کیا طرح تھی۔ ع

تم ہو جس کے ہے اُسی کی کائنات

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی سے اس کی صدارت کی درخواست کی۔ اب تو آپ شوکت کی ہر بات مان لیا کرتے تھے۔ یہ درخواست بھی منظور ہو گئی۔ اور آپ نے مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے ایک نہایت دلچسپ جامع اور پُر مغز خطبۂ صدارت بھی ارشاد فرمایا جس کا وہ حصہ جو اِس خاکسار کے متعلق تھا خصوصیت کے ساتھ بیحد دلچسپ تھا۔ ملاحظہ ہو۔

"بزم مشاعرہ اور وہ بھی لکھنؤ میں اور اس کا صدر ایک دیہاتی اور دیہاتی بھی کیسا زبان و ادب کے شعبہ میں بالکل مبتدی اور شعر و سخن کے باب میں محض غبی۔ داد بانئ مشاعرہ کی خوش طبعی کی دیجئے۔ سبحان اللہ کیا خوب نظر انتخاب پڑی ہے۔ ان کی علمی ظرافت سب پر روشن و آشکار۔ لیکن حقیقت میں آج کی عملی ظرافت ان کا شاہکار۔ دنیا کی نظر میں وہ محض ظریف۔ لیکن آج کے صدر مشاعرہ کے حق

بیں ستم ظریف! یہ صدارت کیا ہے قحط الرجال۔ بلکہ بیرنگئی دہر کا ایک کھلا ہوا نشان۔ اور ایسی عجیب حقیقت کہ اس پر افسانے کا گمان، بلکہ یوں کہیے کہ فسانۂ عجائب کا کوئی ظریفانہ ایڈیشن اگر صاحب کائنات کی سرپرستی میں زیر طبع ہو تو اس کے لیے موزوں عنوان!

اس جلسہ کے بعد اس خاکسار نے اپنی ایک غیر طرحی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ اس غزل میں ایک شعر یہ بھی تھا:

وہ اس غریب نے پایا نہیں مقدر سے
سرِ نیاز کے قابل جو آستانہ تھا

مولانا نے تبسم فرمایا۔ اور دوبار اس شعر کو پڑھوایا۔ اب ہم سمجھے کہ مولانا اس شعر کو کہاں لے کر پہنچے۔ اور واقعی یہ شعر تو معرکۂ نگار پر بڑی اچھی روشنی ڈال رہا تھا۔ ہم بھی سمجھ کر مسکرائے۔ اور مسکراہٹوں کے اس تبادلہ سے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ بتا دیا کچھ سمجھا دیا۔ اور کچھ سمجھ گئے۔

شوکت تھانوی مُردہ باد

جماعت احمدیہ کی طرف سے ہر سال جلسہ سیرۃ النبی صلعم ہوا کرتا تھا اور ہر جلسہ میں ہم ایک نظم پڑھا کرتے تھے۔ مسلسل چار سال تک ہم نے جلسہ

میں نظمیں پڑھی تھیں۔ اور اب تک اس جلسہ میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ مگر ہم تو بڑے مبارک قدم واقع ہی ہوئے ہیں۔ جہاں اور جس معاملہ میں ہمارا دخل ہو جائے۔ پھر خیریت ذرا مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ چنانچہ جس جلسہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس کے لیے صدر ہم کو منتخب کیا گیا تھا۔ اور لکھنؤ میں اس جلسہ کے خلاف پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ کہ یہ "قادیانی" جلسۂ سیرۃ النبی صلعم کے پردے میں دراصل اپنی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور ان کی "چالاکیوں" کو مسلمان سمجھتے نہیں۔ بلکہ اس دھوکے میں چلے جاتے ہیں کہ یہ جلسۂ سیرۃ ہے۔ مگر ہم پر اس پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہ تھا۔ ہمارے پاس بھی لوگ آئے اور ہم کو منع کیا۔ مگر ہم اپنی رائے پر قائم رہے۔ کہ یہ ذکر رسولؐ ہے۔ اور ذکرِ رسول خواہ کسی جماعت کی طرف سے بھی ہو ہر مسلمان کے لیے باعثِ کشش ہونا چاہیئے۔ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اب اس اختلاف کی کیا وجہ پیدا ہو گئی۔ اب سے پہلے ہر سال بڑے بڑے غیر احمدی علماء نے اس جلسہ میں شرکت کی تھی۔ غیر مسلم مقرر اس میں حضور سرورِ دو عالم صلعم کی زندگی پر اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ شیعہ اور سُنی علماء ہر مرتبہ شریک رہے تھے۔ مگر اب اس جلسہ کو یکایک احمدی حضرات کا ایک "داؤں" سمجھ لیا گیا تھا۔ بہر صورت ہم نے کسی کی ایک نہ سنی اور جلسہ کی صدارت کرنے مقررہ وقت پر گنگا پرشاد میموریل ہال پہنچ گئے۔ اس وقت بھی ہال کے دروازہ پر ایک قسم کی پکٹنگ ہو رہی تھی۔ لوگوں کو جلسہ کی شرکت سے روکا

جارہا تھا مگر اس کے باوجود جلسہ میں حاضرین کی تعداد کافی تھی ہم نے ایک مختصر سے خطبۂ صدارت کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع کر دی مگر حاضرینِ جلسہ میں بہت سے حضرات اسی غرض سے آئے تھے کہ جلسہ میں ابتری پیدا کریں چنانچہ ہال کے اندر ہی کچھ لوگوں نے شور و غل شروع کر دیا۔ ہم نے ایک مختصر تقریر میں پھر لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ آپ حضرات سینما دیکھنے میں خاموش بیٹھ سکتے ہیں۔ اور تماشہ کے اختتام پر "خدا بادشاہ کو سلامت رکھے" والا ترانہ نہایت ادب سے کھڑے ہو کر سنتے ہیں مگر یہاں اس وقت شہنشاہِ دو عالمؐ کا ذکر ہو رہا ہے۔ اور آپ اس کو خود سننا تو درکنار دوسروں کو بھی سننے دینا نہیں چاہتے فرض کر لیجئے کہ یہ جلسہ احمدیوں کا ہے مگر ذکر کن کا ہو رہا ہے۔ جن کے نام لیوا آپ بھی ہیں۔ اور رویہ آپ نے یہ اختیار کیا ہے گویا احمدیوں کی ضد میں آپ ان سے بھی بغاوت کر رہے ہیں۔ جو آپ کے ہیں۔ مگر ان الفاظ کا بھی بہت کم لوگوں پر اثر ہوا۔ اس لیے کہ وہ تو گھر ہی سے طے کر کے آئے تھے کہ جلسہ میں ابتری پیدا کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں جلسہ کے باہر بہت کافی مجمع ہو گیا۔ اور لوگوں نے نعرے بلند کرنا شروع کر دیئے۔ جو جماعت احمدیہ کے خلاف تھے مگر اس کے باوجود جلسہ کی کارروائی جاری رہی۔ مگر باہر کے شور و غل کا اثر اب ہال کے اندر بھی پہنچنے لگا۔ آخر حاضرینِ جلسہ میں سے ایک بزرگ نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں جنابِ صدر سے استدعا کروں گا کہ وہ جلسہ کی کارروائی کو ختم کر دیں۔ اس لیے کہ ہم کو ذکرِ حبیبؐ سننے کے

ہیے جس سکون کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ اس آواز کی تائید اور لوگوں نے بھی کی۔ اور اسی وقت باہر سے پھر ایک طوفان اٹھا۔ اب جو نعرے بلند ہو رہے تھے وہ اس خاکسار کے متعلق تھے۔ یعنی "شوکت تھانوی مردہ باد"۔ ادھر سے کچھ لوگوں نے نعرہ بلند کیا۔ "شوکت تھانوی زندہ باد" اور ہم حیران تھے کہ ہم کو ان دونوں میں سے کس کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیے۔ لوگوں نے ہم کو مشورہ دیا کہ آپ پُشت کے دروازے سے نکل جائیے۔ مگر ہم نے اس کو منظور نہ کیا۔ اور اس وقت اپنے دل میں بلا کی جرأت پیدا کر کے ہم صدر دروازہ ہی سے باہر نکلے جہاں دو رویہ لوگوں کی ایک بہت بڑی بھیڑ ہمارے خلاف نعرے بلند کر رہی تھی مگر ہمارے پہنچتے ہی پھر دو قسم کے نعرے شروع ہو گئے۔ "شوکت تھانوی مردہ باد" اور "شوکت تھانوی زندہ باد" اور ہم اسی طوفان سے گذر کر سواری تک آ گئے بانیانِ جلسہ نے اسی درمیان پولیس کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ مگر ہم نے باہر نکل کر پولیس کو اپنی حفاظت سے روکا اور یہ کہہ کر اس مجمع سے گذرنے لگے۔ کہ میرا فیصلہ ان ہی حضرات کو کر لینے دیجئے۔ ایک صاحبزادے کچھ حملہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے تھے کہ ان ہی کے چند ساتھیوں نے ان کو روکا۔ اور ہم بخیریت مجمع سے گذر کر اپنے گھر آ گئے۔ گھر پر اس ہنگامے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ اور سب سے حد پریشان تھے مگر ہم نے گھر جا کر سب کو مطمئن کر دیا کہ دیکھ لو میرے دھڑ پر میرا سر موجود ہے۔ اور میرے تمام اعضا صحیح سالم ہیں +

احمدی

اس سے قبل بھی اس بات کی شہرت تھی۔ کہ شوکت تھانوی قادیانی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ برادران محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب، مولوی محمد عثمان صاحب۔ ڈاکٹر محمد زبیر صاحب اور مولوی محمد طلحہ صاحب ایڈوکیٹ احمدی عقائد رکھتے ہیں۔ اور ان ہی کی حقیقی بھتیجی سعیدہ ہیں۔ چنانچہ یہ عام طور پر خیال تھا کہ ایک احمدی لڑکی غیر احمدی کے نکاح میں نہ آئی ہوگی۔ اس لیے کہ احمدی حضرات غیر احمدی لڑکی بیاہ تو لاتے ہیں۔ مگر غیر احمدی کو دیتے نہیں۔ اس کے علاوہ اب تک دو مرتبہ ہم قادیان جا چکے تھے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے مل چکے تھے۔ ان کے یہاں دعوت کھا چکے تھے۔ بعض احمدی مسائل پر مضامین لکھ چکے تھے۔ ان تمام حالات کے ماتحت ہمارے احمدی ہونے کی جو خبر گرم تھی اس کو بلا وجہ تو نہیں کہا جا سکتا خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ مگر اس جلسہ کے بعد تو اس روایت پر گویا تصدیق کی مہر بھی لگ گئی۔ اور اب ہمارے احمدی ہونے کا ان سب کو گویا یقین ہو گیا۔ جو اب تک مشکوک تھے۔ ہم سے جس کسی نے بھی پوچھا۔ ہم نے یہی جواب دے دیا کہ حضرت صحیح پوچھئے تو احمدی ہم آپ سب ہی ہیں۔ احمد ہمارے رسول صلعم کا اسم پاک تھا۔ اور ان سے نسبت دینا ہم اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں رہ گیا آپ کا یہ خیال کہ ہم مرزا غلام احمد صاحب کو مسیح موعود مانتے ہیں یا نہیں۔ اس کے متعلق ہم نے کبھی آج تک

تک غور ہی نہیں کیا ہے۔ البتہ احمدی حضرات کے اسلامی جوش ان کے اسلامی اصولوں پر سختی سے کاربند ہونے اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے سلسلہ میں ان کی دیوانہ وار سرگرمیوں کو ہم بیشک نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں مگر اس کے باوجود لوگ یہی کہتے رہے کہ صاحب یہ کیونکر ممکن ہے کہ شوکت قادیانی نہ ہوں اور سر محمد ظفر اللہ ان کے دیوان پر گول میز کانفرنس کے اجلاس کی مصروفیتوں کے باوجود لندن میں بیٹھ کر تبصرہ لکھیں، خلیفہ صاحب قادیان اپنے خطبہ جمعہ میں ان کی سودیشی ریل کا ذکر کریں۔ اور قادیانیوں کا اخبار الفضل ان کا ذکر اپنے کالموں میں کرے مگر ہم نے اپنی احمدیت کی اس شہرت پر سنجیدگی کے ساتھ کبھی غور نہیں کیا۔ اس لیے کہ اول تو ہم مذہبی آدمی نہیں ہیں، دوسرے اگر مذہبی آدمی ہوتے بھی تو مذہب کے معاملہ میں خدا کو یقین دلانے کی کوشش کرتے نہ کہ اس کے بندوں کو، مذہب تو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک رشتہ کا نام ہے یہ کوئی سوسائٹی کی چیز نہیں ؛

روزنامہ حق سے علیحدگی

آخر وہی خطرہ سامنے آیا۔ حق کے مالک و مدیر عبد الرؤف صاحب عباسی ان کے برادر محترم علی اختر صاحب عباسی اور ان کے والد محترم مولوی رشید علی صاحب مرحوم کی تمام محبتوں اور تمام مدارات کے باوجود ان حضرات کے قریبی عزیز سے ہم کو

اندیشہ تھا۔ وہی اپنی تمام مخالفتوں کے ساتھ اب بالا علان سامنے آ گئے اب عبدالرؤف عباسی کے بیٹے ایک دوست اور ایک عزیز کا معاملہ تھا۔ لاٹھی مارے مارے پانی جدا نہیں ہوتا۔ بلکہ گھٹنے پیٹ ہی کی طرف جھکتے ہیں۔ ہم اگر یہ مطالبہ کرتے کہ ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیا جائے تو غلط ہوتا۔ لہٰذا ہم نے اپنی شکایت کے ساتھ استعفےٰ پیش کر دیا۔ حق کی ملازمت کے زمانہ میں جو محنت ہم نے کی تھی اور جس خلوص سے کام کیا تھا اس کے پیشِ نظر ہم کو ایک وہم یہ بھی تھا کہ ہم نے بھی تھوڑا بہت استحقاق پیدا کر لیا ہے۔ اور حق کے حقداروں میں ہم بھی ہیں۔ مالی حیثیت سے نہ سہی اخلاقی حیثیت سے سہی کم سے کم اتنا حق تو ہمارا بھی تھا۔ کہ ہمارے اس استعفیٰ پر ہمدردانہ غور کیا جاتا مگر بجائے اس کے ہوا یہ کہ عبدالرؤف صاحب عباسی نے ایک دم اپنی نظریں ایسی پھیر لیں۔ کہ گویا کبھی مراسم تھے ہی نہیں لہٰذا ہم نے اپنے باقی مطالبات سے بھی ہاتھ اٹھائے اور بجائے اس کے رہے سہے تعلقات کو بھی ختم کر دیا جاتا ہم نے ملازمت ہی کو ختم کر دیا۔

رفیع احمد خان کی مداخلت

ہماری اس علیحدگی کی خبر سُن کر رفیع احمد خان نے بغیر ہمارے مشورے کے مداخلت کی اور عبدالرؤف صاحب عباسی کو سمجھایا کہ شوکت کو واپس بلانا چاہیے مگر ان کو جواب یہ ملا کہ "خان صاحب آپ دیکھتے رہیئے۔ وہ حضرت اِدھر اُدھر

جھلک مار کر چلو آئیں گے کون دیتے بیٹھے ان کو چالیس روپیہ ماہوار کی ملازمت۔ خانصاحب کو یہ جواب ناگوار ہوا۔ اور پہلے تو وہ پی گئے۔ مگر کچھ دن بعد ہم کو بتایا۔ کہ میں نے صلح صفائی کی کوشش کر کے یہ جواب سنا تھا۔ ہم نے خانصاحب سے کہا۔ آپ اسی کے مستحق تھے۔ خانصاحب ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے۔ کہ مجھ کو دنیا میں جن چند باتوں پر حیرت ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شوکت "حق" میں کیونکر ملازم ہیں اور یہ ملازمت کیونکر ابھی تک چلی جا رہی ہے۔ عبدالرؤف صاحب عباسی کے اس آخری طرزِ عمل اور رفیع احمد خان نے ان کے جو الفاظ ہم کو پہنچائے تھے۔ ان کی کچھ دنوں تک تو ہم کو شدید تکلیف رہی۔ مگر رفتہ رفتہ ہم ان تمام باتوں کو بھول گئے۔ اور عبدالرؤف صاحب عباسی اور ان کے تمام خاندان سے پھر دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے جو آج تک موجود ہیں۔ حد یہ ہے کہ جن حضرت کی وجہ سے ہم کو حق سے دست بردار ہونا پڑا۔ ان کے ساتھ بھی ہم نے کوئی دشمنی کا خیال اپنے ذہن میں کبھی نہ آنے دیا۔ اس لیے کہ ہم کو یقین تھا اور ہے کہ وہ حضرت ہمارے ساتھ تو کیا خود عبدالرؤف صاحب عباسی کے ساتھ کوئی دوستی نہیں کر رہے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے نقصانات کے علاوہ جو ان کی وجہ سے عبدالرؤف صاحب عباسی کی ہر دلعزیزی کو برابر پہنچتے رہتے ہیں۔ کوئی نہایت شدید قسم کا نقصان ضرور پہنچے گا۔ اور آج نہ سہی کل سہی عبدالرؤف صاحب کو قائل ہونا پڑے گا۔ کہ ان کے یہ عم زاد برادرِ عزیز ان کے راستے میں کس قسم کے کانٹے بو چکے ہیں۔

خان بہادر سید علیم الدین صاحب

خان بہادر سید علیم الدین صاحب او۔ بی۔ ای موجودہ دیوان ریاست ونیا ہمارے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کو اس خاکسار کے ساتھ للّٰہی خلوص ہے۔ آپ نے جب یہ سنا کہ شوکت ان حالات کے ماتحت حق سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ تو فوراً ہم کو طلب کیا۔ اور نہایت جوش میں فرمایا کہ آخر تم اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو۔ اپنا اخبار خود کیوں نہیں نکال لیتے۔ عرض کیا کہ اللہ کا دیا یوں تو سب کچھ ہے صرف روپیہ پیسہ کی ذرا کمی ہے۔ کہنے لگے۔ اس کا انتظام میں کر دوں گا۔ ایک اچھے روزانہ اخبار کی اسکیم بنا کر مجھے دو۔ اور شبیر احمد صاحب علوی کو ہدایت کی۔ کہ شوکت کے سر پر سوار ہو کر اسکیم فوراً مرتب کرا لو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ پھر ملازمت کے چکر میں پڑیں۔ چنانچہ ہم نے ایک اسکیم مرتب کی اور خان بہادر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ دوسرے ہی دن سے خان بہادر صاحب نے اپنے نہایت قیمتی وقت کا ایک حصّہ اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ موٹر پہ ادھر جا رہے ہیں اُدھر جا رہے ہیں۔ ان راجہ صاحب سے ملے اُن تعلقہ دار صاحب سے کہا اور کہنا کیا وہاں تو نادر شاہی حکم ہوتا تھا۔ کہ آپ اتنا روپیہ شوکت کو یا مجھے دے دیجیے نتیجہ یہ کہ چند ہی دن میں اتنا سرمایہ ہمارے لیے جمع کر دیا۔ کہ اخبار نکالا جا سکتا تھا۔ ان صاحبان اور تعلقہ دار صاحبان نے یہ طے کیا کہ یہ اخبار ان کی پارٹی کا آرگن ہوگا۔ خان

بہادر صاحب نے فرمایا کہ اچھا یہی ہی مگر اخبار نکلنا بھی ایسا چاہیے۔ جو اس پارٹی کے شایانِ شان ہو۔ لکھنؤ میں یہ گشت کرنے کے بعد خان بہادر صاحب دورے پر روانہ ہو گئے۔ اور ہم کو ہمارے کام کے لیے علی گڑھ طلب کیا گیا۔ علی گڑھ میں نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خان سے ایک گراں قدر عطیہ دلوایا۔ اور ہم سے چند دوسرے روسا کو بھی ملوادیا کہ ان حضرت سے بھی ضرورت کے وقت مدد لیتے رہنا۔ خان بہادر صاحب کی اس غیر معمولی توجہ نے ہمارے ذاتی روزنامہ کی داغ بیل آخر کار ڈال ہی دی ؛

طوفان اور اُس کا دفتر

روزنامہ کا نام "طوفان" طے پایا۔ چودھری خلیق الزمان صاحب نے "ہنگامہ" تجویز کیا تھا۔ مگر اکثریت کی رائے طوفان کے حق میں رہی۔ لاٹوش روڈ پر ایک معقول مکان دفتر کے قیام اور ہمارے رہنے کے لیے کرایہ پر لیا گیا۔ طوفان کا زبردست سائن بورڈ لگایا گیا۔ اور دفتر کے ابتدائی انتظامات شروع کر دیئے۔ ہماری منہ بولی خالہ بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب کی ممتا اس موقع پر بھی آڑے آئی آپ نے ہمارے دفتر کے لیے تمام فرنیچر اپنی طرف سے دیا۔ اور اس طرح ہماری ذاتی زندگی کی بنیاد میں خان بہادر سید عین الدین صاحب کے ساتھ ہی ایک پتھر ان محترمہ نے بھی رکھ دیا۔ ہم نے اپنا عملہ منتخب کیا۔ خان محبوب طرزی

کو اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا۔ اس لیے کہ آپ ہمارے ساتھ سرپنچ کے علاوہ اودھ اخبار میں بھی رہے تھے۔ روزنامہ ہمدم میں بھی ہم نے آپ کو بلالیا۔ اور اب طوفان کے اجرا کے وقت ہم کو آپ سے زیادہ مناسب معاون کوئی اور نہ مل سکتا تھا۔ برادرم ایمن سلونوی کی انڈپنڈنٹ نیوز سروس کی خدمت ہمارے لیے موجود ہی تھی۔ تبسم صاحب کے انتظامی مشورے ہم کو حاصل ہی تھے مختصر یہ کہ ان سب نے مل کر پرچہ اٹھایا۔

نمونے کا پرچہ

تمام ابتدائی انتظامات کی تکمیل کے بعد ۱۰ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۰ مئی ۱۹۳۸ء کو ہم نے طوفان کا نمونہ کا پرچہ نکالا۔ اور اعلان کر دیا۔ کہ اس کی باقاعدہ اشاعت یکم جون سے شروع ہوگی۔ بلیس دن کا یہ وقفہ اشتہارات حاصل کرنے خریدار فراہم کرنے۔ ایجنسیاں قائم کرنے اور دوسرے تمام انتظامات کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے۔ اور آخر یکم جون کو باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں زمیندار کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ مہاراجہ دربھنگہ صدر اور مہاراجہ صاحب جہانگیر آباد صدر مجلس استقبالیہ تھے۔ تعلقہ داران اودھ کی طرف سے طوفان کی کوئی خاص اعانت تو نہ ہوئی تھی۔ مگر وہ اس کو اپنا ہی اخبار سمجھتے تھے۔ اور کانگریس کی کسان سدھار تحریک سے خائف ہو کر اپنی تنظیم کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ کہ ان کی غفلت

سے فائدہ اٹھا کر ان کی شکارگاہ میں کانگریس شکار کھیلنا نہ شروع کر دے۔ طوفان نے زمینداروں کی سرِ ممکن وکالت کی۔ مگر اس کا کوئی صلہ طوفان کو نہ مل سکا جن تعلقہ داروں نے انفرادی حیثیت سے امداد کی تھی، وہ ہمارے ذاتی تعلقات یا خان بہادر سید علین الدین صاحب کے اثر کے ماتحت۔ لیکن انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے کوئی دست اعانت دراز نہیں ہوا۔ اخبار کا خیر مقدم تو خیر سب ہی نے کیا۔ بڑی بڑی امیدیں دلائیں اور بڑی بڑی توقعات قائم کیں مگر تجوری کسی نے بھی نہ کھولی۔

ہاتھی باندھ لیا

روزانہ اخبار کے مصارف نہ اور ہمارا ایسا ناقہ مست محض خریداروں کا چندہ ایک روزنامہ کو چلانے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے سرمایہ دار ایک روزانہ اخبار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ہمت اور استقلال کا جہاں تک سوال ہے اس کی ہم میں کمی نہ تھی۔ قلمی خدمت کے علاوہ دوڑ دھوپ بھی کافی کر سکتے تھے مگر قسمت کی خوبی ملاحظہ ہو کہ خان بہادر سید علین الدین صاحب بھی ریٹائر ہو گئے اور یہ ہاتھی ہمارے دروازے پر بندھا ہوا چھوڑ گئے۔ کچھ دنوں تک تو ہم اس ہاتھی کے لیے چارہ فراہم کرتے رہے۔ آج خان بہادر سید احمد حسین صاحب رضوی نے ایک عطیہ دے دیا۔ تو کل نواب صاحب چھتاری سے کچھ

حاصل کر لیا۔ تعلقہ دار صاحبان کو متوجہ کیا کہ آپ اس کو اپنا پرچہ کہتے ہیں تو اس کو سنبھالیے۔ مگر وہ ٹھہرے رئیس، ان کو بھلا اس کی کیا فکر کہ ان کی غفلت کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ آخر کار ان کی طرف سے مایوس ہو کر پہلے تو گھر کا جو کچھ بچا کھچا تھا۔ وہ سب اخبار کی نذر کر دیا۔ اس کے بعد برادر محترم ڈاکٹر محمد عمر صاحب سے کچھ روپیہ قرض لیا۔ اور وہ اپنی ایک کتاب کا حق تصنیف حاصل کر کے ادا کیا۔ اپنی منہ بولی خالہ اماں، بیگم صاحبہ خان بہادر شیخ احمد علی صاحب سے کچھ قرض لیا اور سب کچھ اخبار میں لگا کر اس طوفان کی نذر کر دیا۔

طوفان گذر گیا

"طوفان" طوفان بن کر آیا۔ اور طوفان بن کر ہم کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا اور اب ہم پھر گھر کے رئیس تھے وہ تو کہیے کہ عین اسی زمانہ میں آل انڈیا ریڈیو نے اپنا لکھنؤ اسٹیشن کھول دیا اور ہم کو ریڈیو سے کافی آمدنی ہونے لگی تھی۔ تقریریں، ڈرامے، اسکیچ۔ سب ہی کچھ تو کر رہے تھے۔ پھر ایک موقع یہ بھی مل گیا کہ ہماری دو کتابیں ایک ہندی کے پبلشر نے ہندی میں پیش کرنے کے لیے ہم کو معقول معاوضہ دے دیا۔ اور یہ روپیہ ہم نے بیگم کے حوالہ کر دیا کہ آپ سعید اور خورشید کی ختنہ دھوم سے کرانا چاہتی ہیں تو اپنی اس دھوم دھام کو اسی روپیہ کی حدود میں رکھیے گا۔ مگر روپیہ صرف ہوا دوسری صورت سے۔

خورشید کو ڈفتھیریا

اس وقت چھوٹے اور آج کے منجھلے صاحبزادے خورشید عمر کو یکایک بخار ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹمپریچر بہت بڑھ گیا۔ اس نے ایک دن شکایت کی کہ میرے حلق میں درد ہے۔ اور ہم نے یوں ہی دیکھنے کے لیے زبان پر چمچہ رکھ کر حلق جو دیکھا تو خفیف سا ایک سفید رنگ کا دانہ سا معلوم ہوا۔ دل نے فوراً کہا کہ یہ ڈفتھیریا تو نہیں ہے۔ دوڑے ہوئے گئے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اختلاف کیا، مگر ہم مطمئن نہ ہو سکے۔ اور ایک دوسرے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا ان صاحب نے کچھ خفیف سا شبہ ظاہر کرتے ہوئے حلق کے لعاب کا کیمیاوی امتحان کرنے کا مشورہ دیا۔ اس تمام کارروائی میں شام ہو گئی۔ مگر امتحان کا نتیجہ وہی نکلا، کہ ڈفتھیریا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک انجکشن تو خود دیا۔ اور ہم کو مشورہ دیا کہ اسی وقت بچے کو میڈیکل کالج لے جاؤ۔ ڈفتھیریا کی تصدیق نے جان تو نکال ہی لی تھی۔ مگر حواس قائم رکھتے ہم نے فوراً ایک ٹیکسی پر بچے کو میڈیکل کالج پہنچایا۔ اور وہاں اسی وقت داخلہ ہو گیا۔ اور دوسرا انجکشن دے دیا گیا۔ اب میڈیکل کالج میں ہم تھے اور یہ بچہ۔ لاکھ لاکھ سب نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ نہ جائیں گے۔ مگر ہم نے یہ خطرہ کسی اور کو دینا مناسب نہ سمجھا بلکہ متعدی امراض کے اس وارڈ میں جہاں ہر طرف ڈفتھیریا کے مریض تھے، بچے کو لے کر خود ہی اسپتال میں رہے پہلی رات

تو پلک تک نہ جھپکائی۔ اس لیے کہ خورشید خطرہ سے باہر نہ تھا۔ وہ وکٹوریہ ہر طرف سے مریضوں کے کراہنے کی آوازیں، موت کی خبریں۔ جانکنی کی اطلاعات آ رہی تھیں اور ایک عجیب وحشت خود ہم پر طاری تھی۔ چاہتے یہ تھے کہ خورشید آرام سے سو جائے ہم خواہ سوئیں یا نہ سوئیں، ڈفتھیریا کے وہ وکٹوریہ مریض بچوں کو دیکھ دیکھ کر حواس گم تھے کسی کی گردن کی رگیں کٹی ہوئی تھیں۔ اور کبوتروں کے پروں سے ان کو صاف کیا جاتا تھا۔ کسی بچے کو لوگ اس انتظار میں لیے بیٹھے تھے کہ اب یہ آخری سانس لیتا ہے اور کسی کے متعلق یہ شبہ تھا کہ یہ سانس لیتا بھی ہے یا نہیں۔ اسی وحشت ناک ماحول میں گھبرا گھبرا کر نہ معلوم کس طرح صبح کی جب صبح ڈاکٹر نے خورشید کو دیکھ کر ہم سے کہا کہ آپ نے تو بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کو مات کر دیا۔ اور ڈفتھیریا کو اس وقت پہچان لیا۔ جب اس کی طرف خیال ہی مشکل سے منتقل ہوتا ہے۔ ہم خود حیران تھے کہ ہم کو ایک ڈفتھیریا کا خیال کیونکر آ گیا۔ کسی اور مرض کا خیال کیوں نہ ہوا۔ مگر یہ بھی دراصل تائید غیبی تھی۔ اور خداوند کریم کو منظور تھا کہ بچہ بچ جائے۔ لہٰذا ہماری آنکھیں اس طرح کھول دی گئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم کو یقین دلا دیا کہ اب بظاہر کوئی خطرہ نہیں ہے اس لیے کہ وقت پر روک تھام ہو گئی ہے مرض آگے نہیں بڑھا ہے۔ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ ورنہ یہ مرض دیکھتے ہی دیکھتے اور ذرا سی غفلت میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ ہم تو خیر خورشید کے پاس تھے۔ مگر سعیدہ کا بُرا حال تھا وہ گھر پر پریشان تھیں۔ میڈیکل کالج کے قرب کی وجہ سے سعیدہ معہ اپنے تمام

متعلقین سے زرد کوٹھی میں آ گئی تھیں۔ اور روز شام کو دیکھنے آیا کرتی تھیں۔ آج کل ان کو بچے سے زیادہ ہمارے حال پر ترس آتا تھا۔ کہ ہم اس طرح بچے کے ساتھ اسپتال میں پڑے ہیں۔ رات کو زمین پر ذرا کمر سیدھی کر لیتے ہیں۔ دن رات بچے کی ناز برداری کرتے ہیں۔ اور تمام خلاف معمول مشقت کا اثر ہماری صحت پر پڑ رہا تھا۔ مگر خیریت یہ ہوئی کہ خورشید میاں جلد جلد سنبھلنے لگے۔ اور ہم کو زمین ہی پر سہی نیند آنے لگی۔ آخر آٹھ روز کے بعد ان کے حلق کے لعاب کا پھر معائنہ ہوا۔ اور یہ طے ہو گیا۔ کہ مرض کا اب کوئی اثر نہیں ہے۔ لہٰذا ہم ان کو خیریت تمام اسپتال سے لے کر گھر آ گئے۔ اس سلسلہ میں وہ تمام روپیہ جو ان کی تقریب کے لیے رکھا گیا تھا۔ ان کی زندگی حاصل کرنے پر صرف ہو گیا۔ اور ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر ان ہی داموں پر حضرت ہم کو واپس مل گئے تو ہم گویا سستے چھوٹے ورنہ اعمال تو ایسے نہ تھے کہ خدا اتنا بڑا فضل ہم پر کرتا۔

ختنہ اور آئس کی تقریب

عورتوں کے واسطے تو خیر ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ اور اگر وہ ذرا مصیبت پر کمر باندھ لیں تو ہر سال موت اور زندگی کے امتحان میں پڑ سکتی ہیں۔ مگر مردوں کے لیے بھی ختنہ ایک امتحان سے کم نہیں ہے۔ سعید اور خورشید کافی بڑے ہو گئے تھے۔ اول تو ہم کو اپنی غلطی کا افسوس تھا کہ جس وقت یہ حضرت ننھے بچے تھے

اسی وقت اس مرحلہ سے فرصت کیوں نہ کر لی۔ عقیقہ اور ختنہ اگر ساتھ ہی ہو جاتا۔ تو آج یہ فکر نہ ہوتی۔ اور اب زیادہ دیر کرنا اس لیے مناسب نہ تھا۔ کہ فی الحال تو خیر وہ سمجھدار ہو رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری اس غفلت کی بدولت بغیر ختنہ کے بالغ ہو جائیں آخر بیگم صاحبہ کے مسلسل تقاضوں سے مجبور ہو کر پہلے تو چپ چپاتے ختنہ کرا دیا اور پھر جب وہ صحت یاب ہو گئے تو ایک معمولی سی تقریب کر کے ان کا غسل صحت کر دیا۔ حالانکہ ختنہ اور غسل صحت کے درمیان بیچاروں پر عجیب عجیب مصیبتیں گذریں۔ مارے احتیاط کے ہم نے ڈاکٹر کو بھی ختنہ کے وقت بلا لیا تھا اور نائی نے جیسے ہی چھٹی پائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی پٹی چڑھا دی تھی۔ مگر کچھ ہی دن کے بعد زخم کے ارد گرد زہر بلے چھالے پیدا ہو گئے۔ اب نائی نے کہا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی کراہت ہے اور ڈاکٹر نے کہا کہ یہ نائی کے استرے کا زہر ہے۔ مختصر یہ کہ بچے بیچارے سانجھے کی ہانڈی بن کر رہ گئے تھے۔ شکر ہے کہ ہانڈی ٹوٹنے سے بچی۔ اور جتنا دکھ ان غریبوں نے اٹھایا تھا۔ اس کا تھوڑا بہت بدلہ ان کو غسل صحت کے موقع پر مل گیا۔ جب وہ دولہا بن کر محفل میں آ گئے اور گھر میں مہمانوں کی چہل پہل دیکھی۔

آغا کا روپیہ

میں اس سے پہلے تاش اور بازیاں کے زیر عنوان یہ لکھ چکا ہوں۔ کہ تاشوں کے

شوق کے پیچھے ایک مرتبہ میں پوری تنخواہ ہار گیا تھا۔ اور نسیم صاحب سے کہہ کر ایک آغا سے روپیہ قرض لیا تھا۔ اس روپیہ کا سود ہر مہینے ادا ہوتا رہا۔ مگر اصل ادا کرنے کی نوبت کبھی نہ آئی۔ وجہ یہ تھی کہ آمدنی سب بیگم کے ہاتھ میں جاتی تھی۔ اور چند روپے بہانے بازیاں کر کے اور بیگم کو بہلا پھسلا کر ان سے ہم لے لیتے تھے جو آغا کے روپے کا سود دیا کرتے تھے۔ یہ سود ہم آغا کو نہیں بلکہ نسیم صاحب کو دے دیتے تھے کہ تم دے دینا۔ ایک دن اتفاق سے وہ پرونوٹ ہم نے بیگم صاحبہ کے قبضہ میں دیکھا۔ اور جان ہی تو نکل گئی کہ یہ ان کے پاس کہاں سے آیا۔ اور ان کو کیسے خبر ہو گئی۔ بیگم نے اس راز کے کھل جانے کے بعد ہماری بُری طرح خبر لی۔ اور اس قدر شرمندہ کیا کہ اگر خدانخواستہ غیرت دار ہوتے تو پھر ان کو منہ نہ دکھاتے۔ آخر ان سے معلوم ہوا کہ وہ بہت دنوں سے آغا کی قائم مقامی کر رہی ہیں نسیم صاحب نے ہمارے دوستی کے ان سے کہہ دیا کہ شوکت صاحب نے اتنا عرصہ ہوا اس قدر رقم ایک آغا سے قرض لی تھی اور سود کے طور پر اس سے دوگنی رقم ادا کر چکے ہیں۔ اگر اس روپیہ کا انتظام کر دیا جائے تو سود کا یہ سلسلہ ختم ہو۔ بیگم نے روپیہ دے کر پرونوٹ لے لیا۔ اور نسیم صاحب سے کہا آپ شوکت صاحب سے ہر ماہ سود لیتے رہیئے۔ اور مجھ کو دیتے رہیئے۔ چنانچہ وہ سود کی رقم معلوم نہیں کتنے دنوں سے ان کے پاس جا رہی تھی اور اس طرح غالباً وہ بھی اتنا روپیہ وصول کر چکی تھیں۔ جس قدر پرونوٹ حاصل کرنے پر آغا کو ادا کیا تھا۔ مگر اس سلسلہ میں جو

شرمندگی ہم کو اٹھانا پڑی ہے۔ اس کو ہم عمر بھر نہیں بھول سکتے۔ واقعی ایک آنہ سے قرض لینا بہت چھوٹی سی بات تھی۔ اور اس سے بھی چھوٹی بات یہ کہ تاش کھیلنے کے سلسلہ میں یہ حرکت کرنا پڑی تھی۔ اس واقعہ کو یاد کرکے خود اپنے سے نفرت ہوجایا کرتی ہے۔

چوری

اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ مارے صفائی اور سچائی کے ہم اپنی کسی چوری کا حال بھی لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ جی نہیں یہ چوری ہم نے نہیں کی تھی۔ بلکہ ہمارے یہاں ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں ہمارے یہاں ایک ملازم تھا۔ اور ایک تھی اس کے ساتھ عورت جس کو وہ اپنی بیوی کہتا تھا۔ اور ہم کو یقین تھا کہ یہ اس کی داشتہ ہے ان ملازم صاحب کے عشق کا یہ عالم تھا کہ اس عورت کو دیوی کی طرح پوجتے تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کیا کریں کیا پا جائیں اور آسے وے کہ اس کی صرف ایک مسکراہٹ حاصل کرلیں جب دیکھئے مٹھائیاں لا رہے ہیں۔ اچھے اچھے کپڑے خرید رہے ہیں۔ ان کے بناؤ سنگار میں مصروف ہیں مگر اس کے ساتھ کام میں کبھی کوتاہی نہ کرتا تھا۔ اور ایمانداری کا سکہ بھی ایسا بٹھا دیا تھا۔ کہ ہم سب اس پر گھر چھوڑ کر شہر کے باہر تک چلے جاتے تھے۔ ہفتوں وہ تنہا گھر میں رہتا تھا اور بیوی یا داشتہ سے دل بہلایا کرتا تھا۔ ہم لوگ پہاڑ جا رہے ہیں۔ اور وہ گھر کے محافظ ہیں۔ مگر ایک دن

ایک مختصر سے سفر سے واپس آکر دیکھا کہ ملازم صاحب معہ اپنی دلنواز کے غائب فوراً گھر کی تمام چیزوں کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ کچھ نقد روپیہ، کچھ زیور جو ان کے ہاتھ لگ سکا، لے کر غائب ہوئے ہیں یعنی اچھا خاصا ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔ پولیس میں رپورٹ لکھوائی، مگر پولیس کی طرف سے تو یہ مطالبہ ہوا کرتا ہے کہ بتا دو وہ کہاں ہے، پھر ہم پکڑ لیں گے۔ ان حضرت کا کبھی پتہ نہ چلا اور زیور پر زکوٰۃ نہ نکالنے کا یہ پھل ہم کو مل گیا۔ کہ یکمشت سب کی ادائیگی ہو گئی۔

پرائیویٹ سکریٹری

طوفان کے بند ہو جانے کے بعد سے ہم بیکار تو تھے ہی ایک صاحب نے ہم کو ایک راجہ صاحب کا یہ پیغام دیا کہ اگر تم چاہو تو میرے یہاں پرائیویٹ سیکرٹری کی جگہ خالی ہے چلے آؤ۔ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری ابات تو کچھ اچھی سی معلوم ہوئی۔ بن سنور کر حاضر ہو گئے اور اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ راجہ صاحب نے ہمارا تقرر بمشاہرہ یکصد پنجاہ روپیہ ماہوار کر دیا اور ضروری ہدایات دے دیں۔ راجہ صاحب کے حرم سرا میں تشریف لے جاتے ہی لوگوں نے تعزیت کے لیے ہمارے پاس آنا شروع کر دیا کہ سنا ہے کہ آپ پرائیویٹ سیکرٹری ہوئے ہیں۔ اب صبح ہی آپ سے فرمائش ہوئی کہ دس ہزار روپیہ قرض کا فوراً انتظام کرو۔ اگر آپ نے انتظام کر دیا تو خیر ورنہ کل ہی قدر و عافیت معلوم ہو جائے گی۔

ہم دل ہی دل میں ہنستے کہ یہ لوگ ہم کو بھڑکا رہے ہیں۔ اتنا بڑا راجہ بھلا یہ حرکت
کرے گا۔ اس قسم کے لوگ ایسے درباروں میں ہمیشہ ہوتے ہیں۔ جو خود واسطے
تیار رہا کرتے ہیں۔ اور نئے آنے والوں کے قدم کسی طرح جمنے نہ دیں۔ تاکہ ان
کی لوٹ مار میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ راجہ صاحب کی ریاست کافی بڑی تھی حکومت
میں ایک خاص اقتدار آپ کو حاصل تھا۔ خطاب یافتہ تھے اور یہ مسخرے ہم کو سمجھا
رہے تھے۔ کہ راجہ صاحب صبح ہوتے ہی ہم سے قرض کی فرمائش کریں گے
ہم ان ہی باتوں پر غور کر رہے تھے کہ راجہ صاحب کے پرانے پرائیویٹ سیکرٹری
صاحب تشریف لے آئے۔ جن کے متعلق جب بار بار ہم کو یقین دلایا گیا کہ آپ
واقعی پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اور آپ ہی کی جگہ پر ہم بلائے گئے ہیں۔ تو ہم کو یقین
آسکا۔ ورنہ آپ کسی طرح بھی پرائیویٹ سیکرٹری تو پرائیویٹ سیکرٹری پڑھے لکھے آدمی
ہی نظر نہ آتے تھے۔ آپ راجہ صاحب کے منتظر تھے اور یہ انتظار کے لمحات آپ
نے ہمارے ہی پاس بیٹھ کر گزارے۔ اس عرصہ میں معلوم یہ ہوا کہ آپ اپنی بقیہ تنخواہ
حاصل کرنے آئے ہوئے ہیں جو سات مہینے کی واجب الادا ہے۔ ہم ایک دم
اُچھل پڑے۔ اور اُن سے پھر اس مدت کی تصدیق چاہی۔ تو معلوم ہوا کہ آپ نے اس
جگہ پر آٹھ مہینے کام کیا ہے۔ جس میں سے صرف ایک مہینے کی تنخواہ چار قسطوں
میں ملی تھی باقی سات ماہ کی واجب الادا ہے۔ اور اسی کے مطالبہ پر ان کو علیحدہ کیا
گیا ہے۔ اب تو ہمارے ہوش اڑنے کے لیے پر تولنے لگے کہ اتنے میں راجہ

صاحب بہادر تشریف لے آئے اور ہمارے پاس ان حضرت کو بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمایا۔

"شوکت صاحب ان سے حساب بنوا لیجئے اور کہہ دیجئے کہ یہ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو آئیں۔ ان حضرت نے آگے بڑھ کر کہا حضور اس عرصہ میں فاقوں مر جاؤں گا۔"

راجہ صاحب نے پھر ہم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ان کو فی الحال دس روپے دے کر رسید لے لیجئے۔"

ان حضرت نے پھر دست بستہ عرض کیا۔ "سرکار دس روپے میں بھلا کیا کام ہو سکے گا۔"

راجہ صاحب نے ہم کو بلا کر کان میں کہا۔ "پہلے پندرہ دو پھر نہ مانے تو بیس دے کر ٹال دو بڑا کمبخت ہے یہ۔"

ہم نے تعمیل حکم میں ان صاحب کو بیس روپے دے کر رسید لے لی مگر اب یہ خیال تھا کہ خود ہمارا کیا حشر ہو گا۔ اگر ہمارے ساتھ بھی راجہ صاحب نے یہی سلوک فرمایا تو ہم تو گویا کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ ہم اسی کشمکش و پیچ میں تھے کہ ایک نمائندے نے آ کر سلام کیا۔ اور نہایت عاجزی سے کہا کہ اگر ہم اس کے بل کا نصف بھی ادا کر دیں تو وہ ہم کو ایک ٹھنڈے سے سوٹ کا سوتی کپڑا اسی وقت دے گا۔ اور کل بل ادا کر دیں تو یہی سوٹ سلوا دے گا۔ ہم نے یہ تمام باتیں جا کر راجہ

صاحب سے کہہ دیں کہ وہ ہم کو اس شرط پر سوتی سوٹ دے رہا ہے۔ اور اس شرط پر ریشمی سوٹ۔ اب فرمائیے سوتی سوٹ لوں یا ریشمی سوٹ۔ راجہ صاحب نے اس کا حساب پیش کرنے کا حکم دیا۔ یہ حساب کچھ ہزاروں کا نہیں بلکہ پانچ چھ سو روپے کے لگ بھگ ہوگا۔ راجہ صاحب نے سرسری طور پر حساب دیکھ کر کہا "ٹھگ ہے یہ ڈکیتی کرتا ہے اسے پچاس روپے کا ایک چیک دے کر رخصت کرو۔"

ہم نے تعمیل حکم میں بزاز سے کہا کہ پچاس روپے کی ادائگی کا حکم ہوا ہے بزاز نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور آخر راجہ صاحب نے بلا کر اس کو اس قدر ڈانٹا ہے کہ تو بہ بھلی مگر وہ برابر دہائیں دیتا رہا اور آخر دو سو روپے کا چیک لے کر وہاں سے ٹلا۔ اور ہم کو اس نے اس سلسلہ میں پانچ روپے دینا چاہے۔ مگر ہم نے انکار کر دیا جس پر اُسے سخت حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ پرانے سیکرٹری صاحب تو پانچ آنے بھی بقول اس کے نہ چھوڑتے تھے بزاز کے چلے جانے کے بعد ہم نے پھر اپنے متعلق غور کرنا شروع کر دیا۔ کہ ہم کس طرح بھاگیں یہاں سے۔ تمام حالات کا اندازہ کرنے کے بعد ہم یہ سمجھ چکے تھے کہ یہاں تنخواہ تو خیر کسی کو نہیں ملتی۔ مگر یہ لوگ دوسری طرح لوٹ مار کر کے اپنا پیٹ پالتے رہتے ہیں۔ اور کسی کو تنخواہ کی زیادہ فکر بھی نہیں ہوتی۔ مگر یہ بات ہمارے بس کی نہ تھی۔ آخر ہم نے راجہ صاحب کو ایک خط لکھا جس میں صفائی کے ساتھ تمام باتیں لکھ دیں۔ کہ یہاں کا اندازہ کرنے کے بعد

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور یہ ملازمت ان حالات کے تحت میرے لیے ناممکن ہے لہٰذا مجھے اجازت دی جائے کہ میں رخصت ہو جاؤں۔ راجہ صاحب نے اس خط کو دیکھتے ہی ہم کو طلب کیا اور ہم نے ان کے سامنے بھی تمام حالات پیش کر کے معذوری ظاہر کر دی اور صاف صاف کہہ دیا۔ کہ میں دراصل اس قسم کی ملازمت کے ڈھب کا آدمی ہی نہیں۔ راجہ صاحب نے بجائے ہم کو مطمئن کرنے کے اور بھی اندیشہ میں مبتلا کر دیا۔ کہ صاحب یہ تو ریاستوں کی ملازمت ہے۔ تنخواہ تو محض ایک بہانہ ہوتی ہے۔ ورنہ پرورش تو دوسری صورتوں سے ہوا کرتی ہے۔ مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہتا ہے۔ مگر میں چشم پوشی سے کام لیتا ہوں۔ بہر حال اگر آپ اسقدر بددل ہیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ ہم بخیریت تمام اپنی اس ملازمت کے پہلے ہی دن واپس آ گئے۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے پہلے ہی دن ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ورنہ نہیں معلوم کیا حشر ہوتا۔ اگر خدانخواستہ ہم کو پہ اسنے سیکرٹری صاحب کی طرح بننا پڑتا تو اس زندگی سے ہم موت کو ہزار درجہ بہتر سمجھتے۔ وہ حضرت تو کسی کانجی ہاؤس کے منشی کے علاوہ اور کچھ نظر ہی نہ آتے تھے

لکھنؤ ریڈیو

اس بیکاری کے زمانہ میں ریڈیو کی وجہ سے نہایت باکار رہنا پڑتا تھا۔ برادرم ملک حسیب احمد صاحب ڈائریکٹر آف پروگرام تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہم ہی سے

گانا بھی گواتے۔ وہ تو کہیے کہ خیریت یہ گذری کہ ہم موسیقی کے سلسلہ میں نہایت جاہل نکلے۔ گانا تو درکنار راگوں کے نام سے بھی واقفیت نہ تھی۔ البتہ ڈراموں کا محکمہ اور تقریروں کا صیغہ ہماری تحریروں سے چند ہی دن میں ہمیں سونپ دیا گیا۔ تقریروں کا پہلا سلسلہ "سمرقند و بخارا" تھا۔ جس میں تمام تقریریں ہم نے کیں۔ یہ تقریریں مریخ تھیں، اور دنیا کے اس دور کے متعلق تھیں۔ جب انسان راکٹ کے ذریعہ مریخ اس طرح جایا کرے گا۔ جس طرح آج کل ہوائی جہاز کے ذریعہ ہندوستان سے لندن جایا کرتا ہے۔ اور مریخ کے باشندوں سے اس طرح ربط ضبط پیدا ہوگا۔ جس طرح آج کل دنیا کے ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک کے باشندوں سے ربط ضبط پیدا کرتے ہیں۔ یہ تقریریں گویا سیاحت مریخ کی ڈائری کی صورت میں تھیں۔ اس سلسلہ کے علاوہ سب سے پہلا ڈرامہ لکھنؤ ریڈیو کے لیے ہم نے لکھا۔ اس کا نام "خدا حافظ" تھا۔ اس ڈرامہ میں خود ہی ہیرو کا پارٹ بھی کیا تھا۔ اور اس کے بعد تو اس قدر ڈرامے لکھے ہیں کہ اتنی گنتی آتی ہوتی تو اس وقت ریاضی کے بہت بڑے ماہر ہوتے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے ہم سے ڈراموں کا ایک سلسلہ "ٹون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام" کے نام سے لکھوایا۔ یہ ڈراموں کا سلسلہ گویا اسٹیج ڈراموں پر ایک طنز تھا۔ کہ اسٹیج ڈراموں میں کس طرح قافیہ پیمائی ہوتی ہے۔ مثلاً اسی سلسلہ کا ایک مکالمہ یاد آرہا ہے:۔

"وزیر اعظم اس کو چھوڑ دو۔ اس کا منہ دربار کی طرف موڑ دو۔ میرے پہلے حکم کو میرے دوسرے حکم کے پتھر سے توڑ دو۔"

جی چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں اسٹیج کے اس طنز کا تھوڑا سا نمونہ یہاں بھی پیش کر دیا جائے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی، ایک تماشا نام ملاحظہ ہو۔ دمشق کی بیٹی "عرف زہر شبنم"۔ اسی ڈرامہ کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:-

ایک سہیلی — داور سنو۔ شہزادی گلنار اور غم

دوسری — اے نوج دور پار۔ شہزادی کے دشمنوں کو الم

پہلی — بھولی بھالی ہیں۔ خوشی کو بھی غم کہتی ہیں۔

دوسری — گل کی خوشبو کو بھی یہ ناک میں دم کہتی ہیں۔

گلنار — تم کو نہیں معلوم ہے

آٹھوں پہر کی غمہ مجھے اب عذاب ہے۔ جنجال و الدین کو میرا شباب ہے۔

ایک سہیلی — شاہزادی کا شباب اور والدین کو جنجال ہے۔

دوسری — عجیب و غریب خیال ہے۔

شاہزادی — تمہارا سمجھنا محال ہے ہر وقت ان کو میری فکرِ شادی ہے۔ سمجھ لو کہ ختم میری آزادی ہے۔

ایک سہیلی — آہا ہا ہا۔۔۔ شادی

دوسری — مبارک مبارک ذکرِ خانہ آبادی

پہلی — اس خوشی میں آؤ گاہیں۔

دوسری — دونوں ایک دوسرے سے آواز ملائیں۔

گلنار — کیوں مجھ دل جلی کو جلاتی ہو

پہلی — تم بھی تو باتیں بناتی ہو۔ دل کی خوشی کو ہم سے چھپاتی ہو۔

دوسری — شادی ہونے والی ہے نا اتراتی ہیں اور اس قدر خوش ہیں۔ کہ خوشی کو غم بناتی ہیں۔

پہلی — جیسے ہم ان کا دولہا چھین ہی تو لیں گے۔

دوسری — جی ہاں! جیسے ہم ٹن پاسنگ تو رد دیں گے۔

شہزادی — نہیں رونا تو میری قسمت میں لکھا ہے آہ تم کو نہیں معلوم کہ جس پتھر سے میری قسمت پھوڑی جا رہی ہے وہ سہراب ہے اب تم بھی کہو گی میری قسمت خراب ہے۔

پہلی — اے تو سہراب میں آخر کون سی برائی ہے

دوسری — وہ سپہ سالار ہے کیا کوئی دھوبی ہے بہشتی ہے نائی ہے؟

پہلی — وہ بھی تمہاری طرح ہے مورت شباب کی۔

دوسری — پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی

شاہزادی — میرے دکھے ہوئے دل کو نہ دکھاؤ۔ یچھو میں روؤں گی مجھکو نہ ستاؤ

پہلی — اچھا تمہارے سامنے سہراب کی باتیں کریں۔

دوسری — نہیں نہیں تم خود ان کا ذکر کر کے ہم سرد آہیں بھریں

شاہزادی — آہ تم کو نہیں معلوم کہ یہ شادی میری موت کا پیغام ہے۔ اور پھر آب میری موت کا دوسرا نام ہے۔

ایک سہیلی — شادی کا ذکر اور یہ بد فال

دوسری — دور پار دشمن کا یہ حال

پہلی — آؤ ان کا دل بہلائیں

دوسری — چھوڑو اس ذکر کو آؤ گانا گائیں

گانا

تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے
گل تو گل ہے، کلی پر نکھار ہے
تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے

یہ ہوا مست مست — یہ فضا مست مست
ہر ادا مست مست — بخدا مست مست

تو ہے مست اور سب کو خمار ہے
تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے

کیسا رنگین گلاب — جیسے جام شراب
جیسے مست شباب — آپ اپنا جواب

تیرے رُخ پہ مگر وہ نکھار ہے
تیرے گلشن میں کیسی بہار ہے

[شہزادی گاتی ہے]

میرا دل ہے اداس | یہ ہوا کب کا راس
نہیں جینے کی آس | ہر طرف جیسے یاس

گُل کا ہنسنا بھی اب ناگوار ہے
میرے گلشن میں کیسی بہار ہے

[گانا ختم ہونے ہی ایک سہیلی چیختی ہے]

ایک سہیلی — اوئی یہ کون ہے اس باغ میں
دوسری — لو، کیڑا رینگا اُس کے دماغ میں
پہلی — نہیں وہ دیکھو جھاڑی میں ایک سفید پوش
دوسری — غالباً خرگوش
شاہزادی — نہیں نہیں کوئی انسان ہے
دوسری — مگر یہاں کیوں آیا سخت نادان ہے
پہلی سہیلی — انسان کی شکل کا کوئی حیوان ہے۔
اجنبی — (اپنی جگہ پر) آہ! یہ حُسن یہ جوانی میری چلتی پھرتی مرگِ ناگہانی
شاہزادی — (چپکے سے) الٰہی یہ انسان ہے یا حسن کا فرشتہ (زور سے) چمیلی

تم جاؤ سوسن تم بھی اس سے پوچھ آؤ کہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے

اجنبی (اپنی جگہ پر) یہ کون ہے۔ ماہ پارہ۔ میرے دل کی لگی ہوئی آگ کا انگارہ
یہ عورت ہے یا آسمان کا تارہ؟

ایک سہیلی (قریب جا کر) اے شخص تیرا یہاں کیا کام ہے؟

دوسری تو کون ہے تیرا کیا نام ہے۔

اجنبی میں مجنوں ہوں مجھے لیلے کو سب دیوانہ کہتے ہیں
زمانہ بھر کے اہل دل مرا افسانہ کہتے ہیں،

ایک سہیلی (ہنس کر) آہا ہا۔ آپ مجنوں ہیں۔

دوسری تو اپنی لیلے کے پاس جاؤ یہاں کیوں آئے

اجنبی جہاں پہ شمع جلتی ہے وہیں پہ پروانہ آتا ہے

ایک سہیلی یہ دیوانہ نہیں ہے۔ جس جگہ دیوانہ آتا ہے

دوسری تو آپ عاشق زار ہیں

پہلی گویا اپنے دل کے چلتے پھرتے مزار ہیں۔

دوسری معلوم ہوتا ہے کوئی دیوانہ ہے۔

پہلی نہیں نہیں یہ بنا ہوا فرزانہ ہے

دوسری تو پھر یہ چور ہے

شاہزادی (آ جاتی ہے) یہ کیسا شور ہے۔ کیوں بیچارے کو تنگ

کرتی ہوئی ہٹو جاؤ۔

[سہیلیاں چلی جاتی ہیں]

شاہزادی اے شخص تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے

اجنبی صرف ایک نگاہ

شاہزادی تیرا مطلب

اجنبی چاہ

شاہزادی واہ واہ واہ تمہارا کیا مشغلہ ہے

اجنبی کبھی آہ و زاری، کبھی اشکباری، کبھی دل فگاری، کبھی بے قراری

شاہزادی مگر تم نے یہ نہ بتایا تم کون ہو

اجنبی شاہِ دمشق کا یکے از سپاہ

شاہزادی مگر میاں سپاہی تم کو الفت اور چاہ سے کام

اجنبی سپہ گری میرا پیشہ اور محبت میرا جنونِ خام

شاہزادی سپاہی ہوتے ہوئے بھی تم چور ہو

اجنبی اور چوری کرنے کے بعد تم بھی بڑی دیدہ دلیر ہو

شاہزادی میں نے چوری کی؟

اجنبی بیشک ابھی ابھی اسی وقت۔

شاہزادی وہ کیسے

اجنبی یہ شمع سے پوچھو جو پروانہ کا دل چراتی ہے یا اس کلی سے پوچھو جو بلبل کو دیوانہ بناتی ہے۔ اور یا اپنی اس نظر سے پوچھو جو تمہارا دل چرانے کی چغلی کھاتی ہے۔

شاہزادی ایسی باتیں نہ کرو مجھ کو شرم آتی ہے۔

اس طرز میں قافیہ پیمائی کی زبردستیاں تو مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہو جائیں گی۔ مگر اداکاری کی بوالعجبیاں ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ عورتوں کا پارٹ کس طرح مرد کرتے تھے اور پارٹ کرنے والوں کو پرامپٹر کس طرح یاد دلاتا تھا۔ ایکٹر اس کے باوجود کس طرح بھولتے تھے وغیرہ یہ خاکہ ان ریڈیو ڈراموں میں پیش کیا گیا تھا۔ اور یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس پہلے سلسلہ کے چھ ڈراموں کے بعد ہم کو دوسرا اور پھر تیسرا سلسلہ بھی لکھنا پڑا۔ ہمارا نام منشی چھوٹک لال ڈرامہ نگار تھا اور اس تمثیل کے نامی گرامی ایکٹروں میں ملک حبیب احمد اور مسٹر غلام محمود مسٹر ہنسراج لوتھرا اور میاں لطیف الرحمان یہ سب ہی شامل تھے۔ اس سلسلہ میں خود اسٹیشن ڈائریکٹر یعنی جگل کشور صاحب مہرا بھی گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ گویا آپ ہی بالک کمپنی اندر ہیں۔

تنخواہ کی کیا ضرورت ہے

ریڈیو کے اس کام سے اس قدر آمدنی ہونے لگی کہ ہم نے خود بھی یہی سوچا

کہ آخر تنخواہ کی کیا ضرورت ہے۔ اور دوسروں کی غلامی کرنے سے کیا فائدہ مگر ہم کو یہ نہ معلوم تھا کہ یہی روشنی طبع ہمارے بیسہ بلا بننے والی ہے۔ چنانچہ ریڈیو کے ارباب حل وعقد نے غالباً یہ اندازہ کیا ہوگا کہ اس طرح تو یہ شخص بہت روپیہ گھسیٹ لے جائے گا کیوں نہ اس کو خود ہی گھسیٹ لیا جائے۔ چنانچہ ایک دن جگل کشور صاحب مہرا نے ہم سے کہا کہ تم ریڈیو میں آخر باقاعدہ طور پر کیوں نہیں آجاتے۔ ہم کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ لہٰذا ہم نے صرف یہی جواب دے دیا۔ کہ آخر آپ کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے جہاں چاہے بھیج دیجئے اور جو چاہے کیجئے ؀

ریڈیو کی ملازمت

اس گفتگو کے چند ہی دن بعد ایک روز جگل صاحب غریب خانہ پر آئے اور ہم سے کہا چلو ریڈیو اسٹیشن۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ روز ہی وہ اسی طرح گرفتار کر لیا کرتے تھے اور ان کا موٹر اس کثرت سے ہمارے یہاں نظر آتا تھا کہ بچے تک اس موٹر کو ہمارا موٹر کہنے لگے تھے۔ مگر آج جگل صاحب نے کہا یوں نہیں بلکہ باقاعدہ طور پر چلو ہم نے پوچھا خیریت؟ جواب ملا کہ ریڈیو میں ملازمت کا حکم آگیا ہے۔ اور تم آج ہی سے اپنے کام کا چارج لے سکتے ہو یوں بھی روزانہ ریڈیو ہی میں وقت گذرا کرتا تھا۔ اور اب تو گویا پابندی تھی ہو تفریح

تھی وہ دوڑی پڑ گئی۔ اخبار نویسی کی زندگی کو ہمیشہ سے خیرباد کہا۔ اور زندگی کے اس نئے دور کی ابتدا گا بجا کر شروع کر دی ۔